UNIVERSAL LIBRARY
OU_222049
UNIVERSAL LIBRARY

تیرِ نیم کش

فکر تونسوی

2220049

نیا زمانہ ۔ جالندھر

٣٤ ط ١٩١٨
ف ت

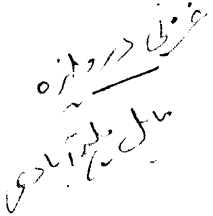

غزل دروازہ

ساحل ملیح آبادی

مخمور جالندھری کے نام

ع سادگی پہ اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے

مصنّف سے ملیے :-

نام :- فکر تونسوی

مقام پیدائش :- تونسہ (مغربی پنجاب)

تاریخ پیدائش :- ۹-اکتوبر ۱۹۱۸ء

دوسری تصانیف —

ہیولے (نظمیں)

چھٹا دریا (ڈائری)

ساتواں شاستر (طنزیہ)

خد و خال (آدمیوں کے خاکے)

ماڈسی تنگ (سوانح)

بیس ہزار چراغ (سفرنامہ)

پنجاب کو سلام (ناول) زیر طبع

65

OUP—901—26-3-70—5,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. [illegible] Accession No. [illegible]

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

تیزِ نیم کش

(طنزیہ)

فکر تونسوی

نیا زمانہ پبلشرز • جالندھر

(جملہ حقوق اشاعت بحق مصنف محفوظ ہیں)

11321

پہلی مرتبہ

اشاعت :- دو ہزار

قیمت :- دو روپے

بابو گوربخش سنگھ جنرل منیجر نیا زمانہ روزنامہ نے جے ہند پرنٹنگ پریس
مستڈی روڈ جالندھر میں باہتمام ترلوک رتن لال سیٹھ پرنٹر چھپوا کر شائع کیا۔

ترتیب

دیباچہ نگار کا دیباچہ
ایک وقت کا کھانا
سگرٹ پینے کی آزادی
قمیص دان تحریک
اِک گھر بنانا چاہیئے
بید کی کرسی
دہلی گائیڈ
مسٹر فِل فِل فلوس
کرائے کا مکان

دیباچہ نگار کا دیباچہ

ؔ——— جناب فکرؔ تونسوی نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اُن کی تازہ تصنیف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ المعروف "تیر نیم کش" کا دیباچہ لکھ کر قارئین کی خدمت میں پیش کروں۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے ——— اس کتاب کا نام "تیر نیم کش" ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدھا کھچا ہُوا تیر۔ یعنی وہ تیر جو جگر کے پار نہیں ہوتا۔ بلکہ آدھا ہی اُترتا ہے۔ چنانچہ کتاب کے نام سے ہی ہم اس کی خوبیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مَیں نے اِس کتاب کی سبھی کہانیوں کے عنوانات نہایت غور و خوص سے پڑھے ہیں۔ اور مَیں اس نتیجہ پہ پہنچا ہُوں کہ ان کہانیوں میں کیا غضب کی چیزیں شامل ہونگی۔ ادب میں عنوان کی وہی اہمیّت ہوتی ہے۔ جو آسمان پر سورج کی ہوتی ہے۔ سبھی اہلِ دانش اس بات پر متفق ہیں کہ یہ نظامِ شمسی

سورج کے محور پر قائم ہے۔ اور جو ادیب اپنی ادبی تخلیقات میں نظامِ شمسی کی جھلکیاں نہیں دکھلاتا۔ اُسے کم از کم میں تو ادیب ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔

مقامِ مسرت ہے کہ جناب فکر تونسوی نے ہمارے ادب کی اس بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ اور آنے والی نسلیں اُن کا نام فخر و انبساط سے لیا کریں گی۔

جناب فکر تونسوی ہمارے آسمانِ ادب پر ایک درخشاں ستارہ کی مانند اُبھر رہے ہیں۔ اُن کے فن کا صحیح اندازہ اُن کی کتاب پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ میں تو صرف اِتنا کہہ دینے پر اِکتفا کرتا ہوں کہ کتاب پڑھ کر آپ صحیح اندازہ لگائیے۔ اور اگر آپ ذوقِ سلیم کے مالک ہیں۔ تو آپ کا اندازہ صحیح ہوگا۔ ورنہ غلط ہوگا۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے کہ کتاب مذکور کی کہانیوں کی تعداد آٹھ ہے۔ بہت کم کتابیں تعداد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ تعداد کی کمی بیشی پر نقادوں، فلاسفروں اور مفکروں کے درمیان صدیوں بحثیں چلتی رہی ہیں۔ افلاطون نے اپنی مشہور و معروف کتاب "ریاست" میں لکھا ہے کہ ادب دراصل حساب کی مختلف منزلوں کا ایک عکسی شیشہ ہے۔ جس میں اس کائنات کے راز درون پردہ جھلکتے ہیں۔

بہرکیف افلاطون کچھ بھی کیوں نہ کہتا ہو۔ میں اپنا دیباچہ اس مصرع پر ختم کرتا ہوں۔ کہ

ع گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

دستخط

دیباچہ نگار

(جس نے پہلے اپنا نام لکھ کر پھر کاٹ دیا)

ایک وقت کا کھانا

ایک دن صبح خوش بخت سنگھ آرٹسٹ سو کر اٹھا تو اُسے معلوم ہُوا کہ آج اُس کا افلاس عروج پر پہنچ چکا ہے۔ یعنی گھر میں ایک پیاز کے سوا کوئی خوردنی چیز نہیں رہی۔

اُس نے بیوی سے کہا ۔

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔"

بیوی نے جواب دیا ۔۔۔

"نہیں یہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ اسی طرح آپ کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔"

آرٹسٹ نے کہا ۔۔۔

"بھاؤ مجھے معلوم ہے۔ آٹا بیس روپے من آتا ہے اور دال دو آنے چھٹانک۔

لیکن سوال یہ ہے کہ بیس روپے اور دو آنے کا اپنا بھاؤ کیا ہے ؟ "

بیوی تپک کر بولی ــــ

" مَیں کیا جانوں ؟ تصویریں تم بناتے ہو۔ بیچنے کے لئے تم جاتے ہو اور بھاؤ مجھ سے پوچھتے ہو۔ مَیں کچھ نہیں جانتی۔ فوراً کھانے پینے کی چیزوں کا بندوبست کرو۔ مارے بھوک کے میری جان نکلی جاتی ہے۔ "

" گھبراؤ نہیں میری جان ! ــــ تمہاری جان نہیں نکلے گی۔ کیونکہ غالب نے کہا ہے

ع جان جاتی ہے پر نہیں جاتی "

" زیادہ باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فوراً جاؤ اور کسی نہ کسی سے کچھ مانگ تانگ لاؤ۔ "

" غیرت مند آدمی مانگا نہیں کرتے۔ "

" تو پھر کسی سے چھین لاؤ۔ "

" چھینا جھپٹی کوّوں کا کام ہے۔ مَیں ایک جھپٹا مارتے ہوئے کوّے کی تصویر تو بنا سکتا ہوں۔ لیکن خود جھپٹا نہیں مار سکتا۔ خدا نے کوّے اور انسان میں فرق رکھا ہے۔ ع خدا پنج انگشت یکساں نکرد

انگشت فارسی کا لفظ ہے۔ تم اِسے نہیں سمجھو گی۔ اس کا مطلب ہوتا ہے اُنگلی۔ خدا نے ایک اُنگلی کوّے کی شکل پر بنائی اور ایک اُنگلی آرٹسٹ خوش بخت سنگھ کی شکل پر ــــ اور آرٹسٹ خوش بخت سنگھ کی اُنگلی بناتے وقت اُس نے یہ خاص احتیاط رکھی کہ وہ ٹیڑھی نہ بن جائے۔ تاکہ وہ اِس سے گھی نہ نکال سکے اور بھوکوں مرتا رہے۔ "

بیوی تڑپ اُٹھی اور بولی ــــ

"تم بھوکوں مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ لیکن میں اور میرے بچے کھانے پینے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور گھر میں ایک چٹکی آٹا نہیں ہے سوائے اِس پیاز کے ایک ٹکڑے کے۔"

آرٹسٹ نے بیوی کی معطّر زلفوں میں اُنگلیاں ڈال کر کہا۔

"لاؤ اُس پیاز کو مشین سے پسوائے لاتا ہوں۔ گوندھ گاندھ کر کھانا بنالیں گے۔"

یہ سُن کر آرٹسٹ کی بیوی رو دی۔ موتیوں کی طرح سفید سفید مہنگے اور قیمتی آنسو اُس کے سیب ایسے سُرخ رخساروں پر کشیدہ کاری کرنے لگے۔ آرٹسٹ خوش بخت شگھ کو یوں لگا جیسے اُس کی بیوی کے اندر ایک آرٹسٹ کی آتما چھپی ہوئی ہے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ اُس کے آنسوؤں کے نازک آبگینوں میں سے اُسی کا چہرہ بھی نظر آرہا ہے۔ اُس نے اِن آنسوؤں میں جھانک کر دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اُس کی داڑھی بڑھ آئی ہے۔ آنکھوں میں زردی ہے اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ ہے۔ اپنے چہرے کی یہ حالت دیکھ کر وہ آرٹسٹک طریقہ پر ہنسا اور پھر بیوی کو سمجھاتے ہوئے بولا ــــ

"دیکھو میری جان! ہماری اور تمہاری محبّت اب کافی پروان چڑھ چکی ہے۔ اس کی جڑیں بھُوک اور فاقے کی زمین میں بہت گہری جا چکی ہیں۔ اس محبّت کو اب اِن آنسوؤں کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ آنسو ٹکسال نہیں ہوتے کہ اِس میں سے دم زدن میں دس روپے کا نوٹ نکل آئے گا ــــ دس روپے کا نوٹ تو بہت بڑی چیز ہے۔ اِس آنسو میں تو ایک پیسہ تک بھی ڈھالنے کی صلاحیت نہیں۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے اپنے آنسوؤں کو۔ وہ دن لد گئے جب عورت کے ایک ایک آنسو پر لوگ سلطنتیں لُٹا دیتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانہ کے آنسو ایک تنکا تک نہیں توڑ سکتے۔"

آرٹسٹ کی بیوی نے دوپٹے سے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر سنجیدگی سے

کہنے لگی :۔

" تم کٹھور دل ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں گذشتہ پانچ دنوں سے پڑوسنوں کی منتیں خوشامدیں کر کے آٹا لا رہی ہوں۔ لیکن اب یہ ہاتھ پھیلائے نہیں جا سکتے"

آرٹسٹ نے بیوی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ گورے گورے سفید ریشم ایسے نرم، لچکیلے ہاتھ اور اُن میں کالی کالی چمکیلی چوڑیاں۔ سپیدی اور سیاہی کا رومانٹک امتزاج۔ سیاہ و سفید کی مالک بیوی۔ بھلا ایسے ہاتھ پھیلائے جا سکتے ہیں؟۔ آخر عورت کی حسین گولائیاں اور سڈول کلائیاں بھی کوئی چیز ہوتی ہیں۔ واقعی یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

آرٹسٹ کی خودداری یک دم جاگ اُٹھی۔ اُس نے مُکّہ تانا۔ چھاتی تانی۔ پیشانی تانی اور غیرت اور مردانگی کی تان پر یہ مصرع گنگناتا ہُوا گھر سے باہر آ گیا۔

ع کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

آرٹسٹ خوش بخت سنگھ کون تھا؟ یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ لاکھوں کروڑوں میں ایک تھا۔ اُن لاکھوں کروڑوں میں سے ایک۔ جو کام نہیں جانتے اور بھوکوں مرتے ہیں۔ جو کام جانتے ہیں لیکن کام حاصل نہیں کر سکتے اور بھوکوں مرتے ہیں۔ جو کام جانتے ہیں۔ کام کرتے ہیں لیکن اُجرت نہیں ملتی اور بھوکوں مرتے ہیں۔ یہی جگت کی ریت ہے۔ آرٹسٹ خوش بخت سنگھ بھی اِسی جگت میں ایک چارپائی کے سائز والے کمرے میں رہتا ہے۔ ایک بیوی دو بچے اور چند تصویریں اِتنی مختصر سی ذمہ داری کو بھی یہ ساڑھے پانچ فٹ کا لمبا چوڑا آرٹسٹ نہیں

نبھا سکتا ۔ اُف ہے اُن تصویروں پر جو بن جاتی ہیں لیکن بکتی نہیں ۔

وہ گذشتہ ایک سال سے دہلی میں رہ رہا ہے ۔ نہ کام ہے نہ دام اور نہ نام اسی لئے فاقوں کے معاملے میں بڑا خرانٹ ہو چکا ہے ۔ پاس باعزت طریقہ سے فاقے کر لیتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی ۔ آرٹ کے ساتھ ساتھ فاقوں میں بھی اُس نے کمال حاصل کر لیا ہے ۔

آج بھی آرٹسٹ کو فاقہ پر کوئی غصّہ نہیں آیا ۔ لیکن فاقہ کے غلط وقت پر آنے سے اُسے کافی غصّہ آیا اور اسی غصّہ کی حالت میں وہ کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں گھر سے نکل کر گلی میں آگیا ۔ یہ احساس اُسے بار بار مردانگی پہ اُکسا رہا تھا کہ مہینہ بھر کے لئے نہ سہی لیکن ایک وقت کے کھانے کا انتظام تو وہ ضرور کر سکتا ہے ۔

جب وہ گلی میں آگیا تو اُس نے سوچا ، مشرق کی طرف جانا چاہئے ۔ پھر اُس نے سوچا مغرب کی طرف جانا زیادہ مُفید رہے گا ۔ اور تیسری بار اُس نے سوچا کہ وہ مشرق و مغرب کے جھنجھٹ میں کیوں اُلجھ رہا ہے ۔ اُسے تو آٹے کی تلاش میں جانا ہے نہ کسی قسمت کی تلاش میں ۔

اور وہ کسی ایک طرف کو چل پڑا ۔ اُس کا سر جُھکا ہُوا تھا اور ہاتھ ساکن تھے ۔ اور آنکھیں نیم وا تھیں ۔ آرٹسٹ ہمیشہ ہی خوابناک اور کھوئی کھوئی کیفیت میں چلا کرتے ہیں ۔ چاہے آٹے کی تلاش میں جائیں چاہے کسی وزیر کی دعوت پر ۔

گلی کے کسی حصّہ میں آٹا نظر نہ آیا ۔ گلی میں بلڈنگیں تھیں ۔ گائے بھینسیں بندھی ہوئی تھیں ۔ ایک ٹرک کھڑا تھا ۔ ایک بچّہ گیند کھیل رہا تھا ۔ ایک نالی میں گندہ پانی

بہہ رہا تھا۔ ایک کالج کی لڑکی دو چوٹیاں لہراتی ہوئی جا رہی تھی۔ آٹا کسی کے پاس نہیں تھا۔

سڑک پر پہنچکر خوش بخت سنگھ آرٹسٹ کو خیال آیا کہ سڑک پر جانا بالکل بے کار ہے۔ کیونکہ سڑک پر تو ہر آدمی پیسے لے کر بات کرتا ہے۔ اور کسی آدمی سے اس وقت تک بات کرنا فضول ہے۔ جب تک جیب میں پیسہ نہ ہو۔ پیسہ — آٹے اور بات دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ لیکن اُسے یہ فضول باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ وقت قیمتی ہے اور اُسے کوئی قیمتی بات سوچنی چاہئے۔

گلی کے سرے پر ایک نل تھا۔ وہاں ایک ادھیڑ سی لیکن حسین عورت پانی کی گاگر بھر رہی تھی۔ حسین عورت کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے سوچا۔ شاید اُسے کوئی زخم یا چوٹ لگی ہے۔ اب یہ پانی کی گاگر اس زخمی کلائی سے کیسے اُٹھ سکے گی۔ اگر وہ خود یہ گاگر اُٹھا کر اُسے اُس کے گھر پہنچا دے۔ تو اس کے بعد وہ احسان کا بدلہ لینے کے لئے اُس عورت سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اُسے آٹے کا ایک پاؤ۔ آدھ سیر۔ ڈیڑھ پاؤ جتنا بھی مناسب سمجھے دے دے۔

اُس نے حوصلے کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور نل کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا آپ مہربانی فرما کر یہ بتا سکتی ہیں کہ .... کہ .... (میں آپ کی گاگر اُٹھا کر گھر تک چھوڑ آؤں) کہ اس محلے میں راشن ڈپو کہاں ہے؟"

عورت نے حیا کا دوپٹہ اپنی آنکھوں پر اُتارا — اور جواب دیا۔

"کسی مرد سے جا کر پوچھئے۔"

آرٹسٹ خوش بخت سنگھ نے سوچا کہ یہ عورت بہتر تعلقات کی صلاحیت

سے قطعی محروم ہے۔ مَیں نے اچھا کیا کہ اِس سے گاگر اور آٹے کی بات نہیں کی۔ آہ! اِس مُلک کی بدنصیب عورتیں!! اُجڈ عورتیں!!!

" اُسے دوبارہ گھر جانا چاہئے۔" آرٹسٹ کو پھرتی سے ایک خیال سُوجھا۔

" یہ اُس کی نری حماقت ہے کہ وہ بغیر کسی پلیننگ کے گھر سے چلا آیا۔ کم از کم اُسے اپنی کوئی تصویر تو گھر سے اُٹھا لانی چاہئے تھی۔ آٹا کوئی گلیوں میں تو بکھرا نہیں پڑا ــــــ آٹے کے مقابلے پر کوئی تصویر میرے پاس ضرور ہونی چاہئے تھی۔

اور وہ گاگر والی عورت کو چھوڑ کر تیزی سے ڈگ بھرتا ہُوا گھر پہنچا۔ تصویر بغل میں دبائی اور ایک کامیاب اور ماہر چور کی طرح جس کے ہاتھ میں نقب توڑنے کا سامان آگیا ہو۔ سینہ پھُلائے باہر آگیا۔ اِس مرتبہ اُس نے پہلے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ راستہ بازار کی طرف نکلتا تھا اور عام طور پر کھانے پینے کی چیزیں بازار ہی میں فروخت ہوتی ہیں۔

کیا وہ یہ تصویر لے جا کر لالہ بینی پرشاد دال، تیل، نمک والے کی سیوا میں پیش کرے؟ تاکہ وہ تصویر کے رنگوں، زاویوں، جذبوں اور کیفیتوں پر مستانہ وار جھوم اُٹھے۔ اور اُسے دو چھٹانک دال اور دو چھٹانک گھی اور کوئلے اور نمک مسالہ دے دے؟

خیال بُرا نہیں تھا۔ تصویر بھی بُری نہیں تھی۔ اُس تصویر میں اُس نے ایک دوشیزہ کو دوپٹے کے نازک اور مہین تاروں میں سے جھانکتے ہوئے دکھایا تھا ممکن ہے لالہ بینی پرشاد موڈ میں آکر اِس تصویر پر لٹو ہو جائے اور اِس دوشیزہ کو گھر کی رانی بنانے کے خیال سے خرید لے۔ آخر اِس دوشیزہ کو کسی نہ کسی کے ساتھ

تو بیاہ کرنا ہی ہوگا۔ میرے گھر پڑے پڑے تو اس کی جوانی بے کار بیت جائے گی۔

لالہ بینی پرشاد ترازو کی ٹوٹی ہوئی لڑی کو جوڑنے میں مصروف تھے۔ آرٹسٹ خوش بخت سنگھ نے سوچا ــــ لالہ یقیناً فراغت کے موڈ میں ہے اور تیر نشانے پر بیٹھے گا۔ قریب جا کر اُس نے ڈائرکٹ سوال کیا۔

"لالہ جی! یہ تصویر خریدیئے گا؟"

"جی نہیں ــــ ہماری دوکان پر تصویروں کی بکری نہیں ہوتی۔ ہم تو نون تیل بیچتے ہیں مہاراج!"

"کیا بھاؤ ہے نون تیل کا؟"

"بڑھتا گھٹتا رہتا ہے جی!"

"کیا کوئی چیز بے بھاؤ کے بھی بکتی ہے؟"

"قہ ... قہ قہ ...."

لالہ نے آرٹسٹ خوش بخت سنگھ کو بے وقوف سمجھ کر قہقہہ لگایا۔ قہ ... قہ ــــ بابو! کبھی بے بھاؤ کے بھی چیزیں بکی ہیں؟ کوئی اندھیر گردی تھوڑی ہے۔"

آرٹسٹ نے کہنا چاہا ــــ "ہاں اندھیر گردی ہے۔ کیونکہ میری اس تصویر کو دیکھو جس کا بازار میں کوئی بھاؤ ہی نہیں ہے۔" لیکن لالہ بینی پرشاد شاید اس کے جواب میں پھر ایک اور احمقانہ قہقہہ لگائے گا۔ اس خیال سے آرٹسٹ نے اُس ذلیل قہقہے سے بچنے کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا آرٹسٹک سوال نہ کیا جائے۔

لالہ بینی پرشاد پھر اپنا ترازو جوڑنے میں مصروف ہو گیا ــــ اور آرٹسٹ خوش بخت سنگھ غصہ میں آکر وہاں سے چل دیا اور ایک سگریٹ پان والے کی دوکان

پر جا پہنچا۔

" میاں حمیدے! یہ تصویر لگاؤ گے اپنی دوکان پر؟ "

" کیوں نہیں لگائیں گے جی! کیا یہ نرگس کی تصویر ہے جی؟ واہ جی واہ۔ کون سی فلم والے ہیں جی آپ؟ "

" مَیں فلم والا نہیں۔ آرٹسٹ ہوں۔"

" کاہیں جی؟ "

" آرٹسٹ! آرٹسٹ!! آرٹ والا۔ تصویریں بنانے والا۔" آرٹسٹ خوش بخت سنگھ نے آرٹ کا مفہوم واضح کیا۔

" خیر جی آپ چاہے کچھ ہوں۔ لیکن ہم یہ تصویر اپنی دوکان پر ضرور لگا دینگے پر بابو جی! سالا پوسٹر وسٹر ہوتا تو ذرا ٹھاٹ رہتا۔ خیر لائیے! یہ چھوکری بھی بڑے نخرے والی معلوم پڑے ہے۔ لائیے اسے یہاں مدھوبالا کے سنگ لگائے دیتا ہوں۔"

آرٹسٹ خوش بخت سنگھ کا جی چاہا۔ حمیدے پان والے کی پان سے بھری باچھیں چوم لے۔ آرٹسٹ اچھا ہو تو قدردان مل ہی جاتے ہیں۔ اُس نے تصویر بڑھا کر حمیدے پان والے کے ہاتھ میں دے دی۔ اور پھر خالی ہاتھ ہو کر بھرپور نگاہوں سے حمیدے کی طرف دیکھنے لگا۔

" کیا بابو جی پان کھائیے گا پان؟ " حمیدے نے آرٹسٹ کی منتظر نگاہوں، بغیر اندازہ لگا کر کہا۔ جو کاغذ

" نہیں مجھے پان نہیں چاہیئے، آٹا چاہیئے۔"

"آہا! ہا ہا۔ آپ کو گلتی لگی بابو جی! مَیں تو بس پان ہی رکھتا ہوں۔ آٹے کا ڈپو تو اُدھر کھمبے کے پاس والی گلی میں ہے۔ بابو جی!"

"اور سبزی کہاں ملتی ہے؟" آرٹسٹ نے جل بھن کر کہا۔

"عام ملتی ہے جی سبزی تو۔ ریڑھیوں پر کھلے بندوں بیچتے پھرتے ہیں۔ کوئی پابندی نھئی ... پیسہ دیجئے اور سبزی لے لیجئے۔ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔"

آرٹسٹ تلملا اُٹھا اور پسینہ پسینہ ہو گیا اور پھر اُس کی گھگی بندھ گئی اور اُس نے محسوس کیا کہ اگر اُس نے حمیدے سے تصویر کی واپسی کا تقاضا کیا تو حمیدہ اُسے گھٹیا، نیچ، خود غرض اور کمینہ انسان سمجھے گا۔ اور کمینے آدمی کے ساتھ انسان کو کمینہ نہیں بننا چاہئے۔ چنانچہ اُس نے دل ہی دل میں حمیدے پان والے پر تھوکا اور چل پڑا۔

اب تصویر بھی اُس کے پاس نہیں تھی۔ تصویر کا بوجھ تو اُس کے سر سے اُتر گیا۔ مگر اس طرح کم از کم یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ اُس کی تصویر کسی بھی حالت میں ایک وقت کا کھانا حاصل نہیں کر سکتی۔ ایسی تصویر کو اُٹھائے اٹھائے پھرنا اور سر بازار آرٹ کی توہین کرانا اُس کے آرٹسٹک منصب کے شایانِ شان نہیں تھا تو پھر ایک وقت کا کھانا کیونکر حاصل ہو گا؟

اُس کے ذہنِ رسا میں ایک خیال تھرکا ـــــ کیوں نہ تصویر کی بجائے گھر کی کوئی چیز بیچ کر پیسہ حاصل کیا جائے؟ مثال کے طور پر کوئی گلاس بیچا جائے۔ تھالی یا توا بیچا جائے۔ توا کے فوراً بعد اُسے خیال آیا اگر توا بک گیا تو روٹی کیسے پکے گی؟" اپنی اس عقلمندی پر وہ مُسکرایا۔ کیوں نہ گھر کی لالٹین بیچی جائے۔ روٹی تو

اندھیرے میں بھی بیٹھ کر کھائی جا سکتی ہے۔ اپنی پتلون بیچ دے۔ بیوی کا جمپر بیچ دے۔ لڑکی کی سلیٹ بیچ دے۔ ٹرنک فروخت کر دے۔ چارپائی بیچ دے۔ اِس بھرے پُرے گھر میں کوئی بھی دو چار چیزیں بیچ کر ایک وقت کے کھانے کا سامان خریدا جا سکتا ہے۔

فرختنی چیزوں کی فہرست کو ذہن میں پھیلا کر اُسے بہت حوصلہ ہُوا۔ اور اُس نے سوچا کہ اَب وہ راشن ڈپو والے کے سامنے سینہ تان کر جائے اور اُس سے پتہ لگائے کہ آج کل ڈپو پر اچھا آٹا آ رہا ہے یا امریکہ کی گھٹیا گندم مِل رہی ہے۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنی فرختنی اشیاء کی ایک لِسٹ کاغذ پر لکھ لے اور راشن ڈپو والے کو جا کر دکھا دے۔ مُمکن ہے وہی اُن میں سے چند چیزیں خریدنا پسند کر لے۔ اور اُسے اِدھر اُدھر بھٹکنا نہ پڑے۔ ویسے بھی کاغذ پر لکھی ہوئی چیز ذرا مہذّب اور موقّر معلوم ہوتی ہے۔

ایک دوکان کے تختے پر بیٹھ کر اُس نے چیزوں کی ایک لِسٹ کاغذ پر لکھ لی۔ اور خراماں خراماں راشن ڈپو پر جا پہنچا۔ راشن ہولڈر موچھوں پر تاؤ دیتا ہُوا کُرسی پر بیٹھا تھا۔

آرٹسٹ نے پہلے اُسے سلام کیا اور پھر سفید پوش شُرفا کے انداز میں کاغذ اُس کی میز پر رکھ دیا۔

"معاف کرو بابا!" ڈپو ہولڈر نے کاغذ کے میز پر پہنچنے سے پہلے ہی بغیر سر اُٹھائے کہہ دیا۔ ڈپو ہولڈر نے اُسے کوئی گونگا یا بہرہ گداگر سمجھ لیا تھا۔ جو کاغذ پر اپیل لکھوا کر گھوما کرتے ہیں اور جس کا عنوان عام طور پر یہ ہوتا ہے۔

" اِس محتاج کی مدد کیجئے! "

آرٹسٹ نے کہا ـــــ

" معاف کیجئے۔ مَیں گداگر نہیں ہوں۔ آرٹسٹ ہوں۔ "

ڈیلو ہولڈر نے سر سے لے کر پاؤں تک اُس کا جائزہ لیا۔ اور یہ دیکھ کر مایوس ہوگیا کہ ایک آرٹسٹ اور عام آدمی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

" بات یہ ہے جی! .... "

آرٹسٹ نے رسمی جھجک کو خیرباد کہتے ہوئے کہا ـــــ میرے گھر میں چند چیزیں قابلِ فروخت موجود ہیں۔ جن کی لسٹ حاضرِ خدمت ہے۔ آپ کو اگر ان میں سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرما دیجئے۔ تاکہ مَیں دَوڑ کر گھر سے لے آؤں۔ "

" معاف کیجئے ہم چوری کا مال نہیں لیا کرتے۔ ہم سرکاری کام کرتے ہیں۔ "

یہ سُن کر آرٹسٹ سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ لیکن اُس نے سوچا کہ ہمّت نہیں ہارنی چاہئے۔ سانچ کو آنچ نہیں تو پھر ڈر کاہے کا۔ دلیر ہو کر بولا ـــــ

" دیکھئے جناب! آپ نے مجھے چور سمجھ کر میری توہین کی ہے۔ حالانکہ اگر آپ کو میری اصلی حالت کا علم ہوتا تو آپ آٹھ آٹھ آنسو بہاتے۔ مَیں چور نہیں ہوں آرٹسٹ ہوں اِس لئے غریب ہوں۔ اِس لئے بھوکا ہوں۔ آج میرے گھر میں آٹا نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک وقت کے کھانے کے لئے آٹا چاہئے۔ اِس لئے مَیں شریف اور مہذّب اِنسانوں کی طرح اپنے گھر کی چیزیں فروخت کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر مَیں چور ہوتا تو رات کو نقب لگا کر آپ کے ڈیلو سے آٹے کی پوری بوری چُرا کر گھر لے جاتا اور آپ سر پیٹ لیتے۔ لیکن مَیں آپ سے سیدھے سبھاؤ آٹا لینے کے لئے آیا ہوں۔ "

ڈپو ہولڈر نے ایک سگریٹ سُلگایا اور پھر ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد بولا ــــ

"آپ ایک سیر آٹا مجھ سے لے جایئے مگر اُس کے ساتھ ہی ایک وعدہ بھی دے جایئے کہ آئندہ اِس ذلیل طریقے پر کسی سے بھیک نہ مانگا کریں گے کم از کم مجھ سے کبھی نہیں مانگیں گے؟"

یہ فقرے کافی ذلیل کُن تھے۔ لیکن آرٹسٹ نے دیکھا کہ فقرے کی ذلالت کی نسبت سامنے پڑا ہُوا آٹا زیادہ نفیس ہے۔ نفاست کو ذلت پر فتح حاصل ہوئی اور آرٹسٹ نے اُن ذلیل فقروں کو نگل کر ایک سیر آٹا لے لیا اور ڈپو ہولڈر کا شکریہ ادا کر کے گھر کی طرف لوٹا۔

کامیابی کے نشے میں چُور ہو کر اُس نے آٹا بیوی کے حوالے کر دیا اور کہا۔

" لے بھئی۔ جلدی جلدی کھانا پکا لے اور دیکھو روٹیاں اچھی پکی ہوئی ہوں۔ اور گول گول ہوں۔ سمجھی؟ "

" اور سبزی؟ " بیوی نے دھمکی دی۔

" پیاز سے کھالیں گے۔ افلاس میں آدمی کو عیش و عشرت ترک کر دینی چاہئے"

" پیاز سے تو کھالیں گے۔ لیکن یہ روٹی پکے گی کیسے؟ سلگانے کے لئے کوئلہ بھی تو ہونا چاہئے۔"

تو گویا کوئلہ بھی کھانے پینے کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کو پہلی بار کوئلے کی سماجی اہمیت کا احساس ہُوا۔ وہ سوچنے لگا کہ جس زمانے میں کوئلہ اور آگ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُس وقت انسان کھانا پکانے کے لئے کون سے ذرائع استعمال

کرتا تھا۔ کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ انسان پھل پھول کھا کر پیٹ بھر لیا کرتا تھا۔ اور پھر اُسے یہ سوچ کر انسانی تاریخ کے ارتقا پر شرم آگئی کہ آج کل پھل پھول بھی دُکانوں پر ہی فروخت ہوتے ہیں۔ توڑ تاڑ کر نہیں کھائے جا سکتے۔ حالانکہ کوئلہ پھل پھول سے کہیں زیادہ گھٹیا چیز ہے۔

بہرکیف کوئلہ لانا ضروری تھا۔ کیوں نہ وہ اپنی کتابوں میں سے دو چار کتابیں چھانٹ کر فروخت کر دے۔ مکالمات افلاطون۔ میکسم گورکی کا ناول۔ اقبال کی بانگ درا۔ اور ٹیگور کی گیتانجلی اُٹھا کر اُس نے اُنہیں جھاڑ پونچھا۔ ایک تولیے میں لپیٹا اور بیوی سے کہا ——

"تم آٹا گوندھو اور میں ابھی کوئلے لاتا ہوں۔"

اپنی پیاری کتابوں کے بیچنے کے تصور سے اُسے بار بار جھرجھری آرہی تھی۔ ان عظیم ادیبوں اور مصنفوں نے اُس کے شعور کو جلا بخشی ہے اور اب وہ اُن کے اِس احسان کا بدلہ چکانے کے لئے اُن کی تصانیف کو، اُن کے خیالات کو، اُن کی گہرائیوں اور نکتہ دانیوں کو چند سیاہ کوئلوں کی خاطر جہنم میں جھونک رہا ہے۔

کیا واقعی اُس کے اندر اتنی بے شرمی اور بے غیرتی آگئی ہے۔ کیا واقعی وہ دو روٹیوں کو اپنے پیٹ کے دوزخ میں ڈالنے کی خاطر گورکی اور ٹیگور کو باندھن بنا رہا ہے۔ شیم! شیم! شیم!

اُس نے اپنے دِل کی بے حیائی کو مضبوط کرنے کے لئے اپنے دِل کو دبایا۔ دھڑکن تیز ہو گئی۔ دِل کو اور دبایا۔ دھڑکن اور بڑھ گئی۔ کاش! اُس کے دِل کی دھڑکن ہی بند ہو جائے۔ تاکہ ٹیگور اور گورکی کی آہ پر حرف نہ آئے۔

وہ علاقہ کے بُک اسٹال پر پہنچ گیا۔ جہاں ایک پچاس سالہ سوکھا سڑا بوڑھا اپنی میلی کچیلی گول ٹوپی اور پھٹے ہوئے پاجامے کُرتے کے ساتھ اپنی اڈیوں والی صندوقچی پر کہنی دبائے شاید اُسی کا منتظر بیٹھا تھا۔

"یہ کتابیں ۔ ۔ ۔ کیا آپ انہیں خریدیں گے؟"

آرٹسٹ نے ایسے لہجہ میں کہنے کی کوشش کی۔ جس سے بُک اسٹال والا اُسے چور نہ سمجھ بیٹھے۔

"دیکھئے۔ یہ بہت عظیم ادیبوں کی کتابیں ہیں۔ بالکل نئی بھی ہیں۔ انہیں پڑھ کر لوگوں کے ذہنوں میں انسان کی عظمت اُجاگر ہو جاتی ہے۔"

آرٹسٹ نے دوکاندار پر عظمت طاری کرنے کے لئے کہا۔ تاکہ وہ خریدنے سے انکار کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔

دوکاندار نے کتابوں کو اُلٹنے پلٹنے سے پہلے انھیں ہاتھ میں تولا۔ اُن کی قیمتیں پڑھیں اور پھر منھ بنا کر بولا ــــــ

"یہ کتابیں ہمارے یہاں نہیں چلیں گی۔ کوئی جاسوسی ناول ہو تو لا دیجئے یا پھر کوئی چٹ پٹا عاشقی معشوقی کا ناول ہو۔ کوئی کوک شاستر ہو۔ کوئی رنگین اور خوبصورت ایکٹرسوں کی تصویروں والی کتاب ہو۔ تو میں خرید لوں گا۔ یہ نہیں چلیں گی۔"

آرٹسٹ کا مُنھ لٹک گیا۔

کاش! ٹیگور کسی فلم ایکٹرس پر ناول لکھ دیتا۔ یا خاوند بیوی کے جنسی تعلقات پر کوئی کتاب تو آج کتنا عظیم اور فائدہ مند ادیب ثابت ہوتا۔

" مجھے صرف ایک روپے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ان کتابوں کو گروی رکھ کر مجھے ایک روپیہ دے سکتے ہیں؟ "

آرلسٹ نے ایک نئی تجویز پیش کی۔

" جی یہ تو ردّی خریدنے والوں کا کام ہے۔ میں تو نئی نئی اور اچھی اچھی کتابیں خریدتا ہوں۔ آپ انہیں ردّی والے کے پاس سامنے بازار میں لے جائیے میرا خیال ہے، ایک روپیہ تو نہیں لیکن دس بارہ آنے ضرور مل جائیں گے۔ "

دس بارہ آنہ میں چار عظیم بین الاقوامی ادیبوں کے خیالات اور نظریات فروخت کرنے کا خیال آرلسٹ کو کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ اسی لئے اُس نے دوکان دار کی تجویز رَد کر دی۔ اور کتابیں بغل میں دبا کر سڑک پر آ گیا۔ کتابیں اُس کی بغل میں تھیں۔ روپیہ ٹیک اسٹال والے کے پاس تھا اور کوئلہ کے ڈپو پر تھا ان تینوں چیزوں کو ایک ساتھ کیونکر ملایا جائے۔ آرلسٹ خوش بخت سنگھ جو اپنی ذہانتِ طبع کی بڑیں ہانکا کرتا تھا۔۔۔ ان تینوں چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنے میں ناکام ہو گیا تھا اور اب صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا تھا کہ کتابوں کو نالی میں پھینک دے۔ اور خود زور زور سے بھاگ کھڑا ہو۔

اپنے اندر بزدلی کا یہ احساس پیدا ہوتے دیکھ کر اُسے پھر غُصّہ آیا۔ اور غصّے ہی غصّے میں اُسے ایک نیا خیال سوجھا۔ کہ ایک زمانہ میں جب سکّہ رائج نہیں تھا تو انسان اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے اشیاء کا براہِ راست تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ جب ایک موچی جُوتا بناتا تھا۔ تو وہ جولاہے کے پاس جاتا تھا۔ جس نے کپڑا بُنا ہوتا تھا۔ وہ موچی سے جُوتا لے لیتا اور کپڑا دے دیتا۔

کتنی واضح اور آسان بات تھی۔ جُوتا بناؤ کپڑا لے لو۔ کپڑا بناؤ گندم لے لو۔ گندم اُگاؤ لکڑیاں لے لو۔ لکڑی۔ کوئلہ۔ کتاب۔ وہ اپنے اس خیال پر خود بخود جھوم اُٹھا۔

ٹیگور کی ایک کتاب دے دو کوئلے کا ایک سیر لے لو۔ سیدھی سی تو بات ہے۔ کوئی اُلجھن نہیں۔ کوئی رکاوٹ نہیں۔

وہ قریب قریب اُچھلتا کودتا ہُوا کوئلہ ڈپو والے کے پاس پہنچا اور کہنے لگا ــــ

"شریمان جی! فرض کیجئے آپ موچی ہیں اور مَیں ــــــ"

کول ڈپو والے نے بات اُٹھا کر آرٹسٹ کا سر پھوڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ آرٹسٹ چلّایا ــــ

"سُنئے سُنئے میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور معافی مانگتا ہوں۔۔۔ میرا مطلب یہ بالکل نہیں تھا کہ آپ موچی ہیں اور مَیں جُولاہا ہوں۔ بلکہ مَیں کہنا یہ چاہتا تھا کہ فرض کیجئے آپ کوئلہ بیچنے والے ہیں۔"

"یہ تو مَیں ہوں ہی۔ ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ مَیں کول ڈپو کا مالک ہوں۔"

"بالکل ٹھیک! بالکل ٹھیک! آپ کول ڈپو والے ہیں یعنی آپ کے پاس کوئلہ ہے اور مَیں کتابوں والا ہوں یعنی میرے پاس کتاب ہے۔ تو حساب یُوں ہُوا کہ مجھے کوئلہ کی ضرورت ہے اور آپ کو کتاب کی ــــ اِس لئے۔۔۔۔"

"آپ سے یہ کس نے کہا۔ کہ مجھے کتاب کی ضرورت ہے۔ مَیں تو اَن پڑھ ہوں"

"جب تو آپ کو کتاب کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ دیکھئے میرے پاس یہ کتابیں ہیں۔ آپ انھیں لے لیجئے اور مجھے کوئلے دے دیجئے۔"

کول ڈپو والے نے سمجھا۔ بچارا کوئی دیوانہ ہے اس لئے دلچسپی اور رحم کے ملے جلے جذبے سے کہنے لگا ــــ

"تم کوئلہ لے کر کیا کرو گے؟"

"کھانا پکاؤں گا۔ ہمارے پاس ایک سیر آٹا ہے۔ ایک پیاز ہے۔ صرف کوئلہ کی کسر ہے۔"

کول ڈپو والے نے مذاق کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ــــ

"کوئلہ لینا ہے تو پیسے نکالو!"

"پیسے لینے ہیں تو کتابیں خرید لو۔"

کول ڈپو والے نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے کہا ــــ

"کتنے کوئلے چاہئیں تمہیں؟"

"ایک سیر!"

"اٹھا لو۔"

آرٹسٹ خوش بخت سنگھ نے کول ڈپو والے کو تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کتابیں اس کے حوالے کر دیں اور تولئے میں تھوڑے سے کوئلے لے کر باندھ لئے اور جانے لگا۔

کول ڈپو والے نے آواز دی ــــ

"ارے او پگلے! یہ کتابیں بھی لے جاؤ! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ

مَیں اَن پڑھ ہوں۔"

آرٹسٹ نے سمجھا شائد مذاق کرتا ہے۔ وہ ہنسنے لگا۔ کول ڈپو والا بھی ہنسنے لگا۔

دونوں ایک دوسرے کو بے وقوف سمجھ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

چند منٹ بعد آرٹسٹ خوش بخت سنگھ اپنے کمرے کے دروازے پر فخر سے سینہ تانے کوئلوں کی پوٹلی جھلاتا ہُوا پہنچ گیا۔ ایک وقت کے کھانے کے سامان میں اب کسی چیز کی کمی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور وہ اپنی مسلسل جدّوجہد پر بے حد نازاں تھا۔ کامیابی نے اُس کے پاؤں چُوم لئے تھے۔ اور کھانا تیار ہونے میں اب صرف تھوڑی سی ہی دیر تھی۔

بیوی اُس کا اِنتظار کر رہی تھی۔ آرٹسٹ نے کوئلے اُس کے حوالے کئے اور کہا ــــــ

"اِنہیں جلدی جلدی انگیٹھی میں سُلگا لو!"

بیوی پرماتما کا شکر ادا کرتے ہُوئے انگیٹھی میں کوئلے ڈالنے لگی ــــ آرٹسٹ ٹانگیں پھیلا کر چارپائی پر لیٹ گیا اور سیٹی بجانے لگا۔ بیوی نے کوئلے دہکاتے دہکاتے آرٹسٹ کو ایک لفافہ دیا اور کہا ــــــ

"ابھی ابھی یہ لفافہ ایک چپراسی دے کر گیا ہے۔"

آرٹسٹ نے لفافہ چاک کیا۔ خط نکالا۔ پڑھا۔ یہ خط ایک دعوت نامہ تھا جو راشٹرپتی بھون سے آیا تھا۔ اُس میں تحریر تھا ــــــ

" آج راشٹرپتی اپنے دیش کے آرٹسٹوں سے مل رہے ہیں۔ آپ بھی تشریف لائیے اور دوپہر کا کھانا بھی راشٹرپتی بھون میں تناول فرمائیے! "

خط پڑھ کر آرٹسٹ خوش بخت سنگھ چلّایا ——— " کوئلے مت دہکاؤ۔ یہ شام کا کھانا پکانے کے کام آئیں گے۔ دوپہر کا کھانا راشٹرپتی کے یہاں رہے گا ..... "

سگرٹ پینے کی آزادی

راستہ میں چلتے چلتے یکدم مجھے خیال آیا کہ گذشتہ تین گھنٹوں سے میں نے سگرٹ نہیں پیا۔ مجھے فوراً ایک سگرٹ پینا چاہیئے۔

اس خواہش کو دبانے کے لئے میں نے کافی جدوجہد کی۔ پیٹ کو دونوں طرف سے دبایا۔ آنکھیں بند کیں۔ کھول دیں۔ ہاتھوں کو جیب میں ڈال کر گرم کیا۔ راہ چلتے ایک آدمی کو ٹھوکا دے دیا۔ تاکہ ذرا گرما ہو جائے اور سگرٹ پینے کی خواہش شور و غل میں گم ہو جائے۔ لیکن سب طرف سے ناکامی ہوئی۔ کوئی بھی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سگرٹ پینے کی خواہش اور تیز ہو گئی۔ اور میں قریب قریب لڑھکتا ہوا ایک سگرٹ فروش کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور کہا

"آپ کے پاس کیپسٹن سگرٹ کی جو یہ اتنی ساری ڈبیاں دکھائی دے رہی

ہیں۔ کیا یہ پینے کے لئے ہیں؟"

دوکان دار نے بڑے روکھے سے انداز میں سر ہلایا۔ لوگوں کو خوش خلقی سے سر ہلانا بھی نہیں آتا۔

"——— از راہِ نوازش کیا آپ مجھے کیپسٹن کا ایک سگرٹ عنایت فرما سکتے ہیں۔ میں آپ کے اِس احسان کا جس حد تک ممکن ہوگا۔ ممنون ہوں گا۔ اُمید۔ اغلب ہے کہ آپ کو ایک سگرٹ عطا کرنے میں کوئی ذہنی کوفت نہیں ہوگی۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ دوکان دار کافی جاہل ہے۔ کیونکہ وہ بدھوؤں کی طرح میرا مُنہ تکنے لگا۔

پھر اچانک اُس کی آنکھ کی پُتلیوں میں بڑی سنجیدہ سی حرکت آئی۔ اور اُس نے نہایت عقلمندوں کے سے انداز میں کہا۔ "میں حرام خوروں کو سگرٹ نہیں دیا کرتا۔ سمجھ گئے آپ؟ سمجھ گئے کہ نہیں؟"

میں کیونکر سمجھ سکتا تھا۔ کوئی پیچیدہ بات ہوتی۔ تو شائد چند منٹ کے لئے میں ناسمجھی میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھ لیتا ——— چنانچہ میں نے دکاندار سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ میری سمجھ پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔

اس مرتبہ دوکاندار جھلا گیا اور کہنے لگا ———

"تو پھر سُن لو۔ اس سے پہلے کہ میں تمہارا سر توڑ دُوں۔ تم کسی کی جیب کاٹ کر ایک آنہ چُرا لاؤ۔ تاکہ تمہیں ایک سگرٹ مل جائے۔ جاؤ۔ بھاگ کر جاؤ۔"

میں نے بھاگنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس کی بجائے جیب سے ایک آنہ نکال

کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دکاندار ایک بار پھر بُدھوؤں کی طرح میرا مُنہ تکنے لگا۔ اور چاروناچار ایک سگرٹ نکال کر میری طرف پھینکا اور بولا۔

" تم نے ضرور یہ ایک آنہ کہیں سے چرایا ہوگا۔ ورنہ اِس شہر میں چوری کئے بغیر ایک آنہ کسی طرح نہیں مل سکتا۔"

اگرچہ میرے پاس صرف یہی ایک آنہ تھا۔ لیکن یہ چوری کا یقیناً نہیں تھا۔ اس لئے مجھے بھی غصّہ آگیا۔ اور میرا جی چاہا کہ چوک کے کانسٹیبل کو بُلا کر اسے گرفتار کرادوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر چُپ ہو رہا کہ خوا مخواہ ہنگامہ ہو جائے گا۔ اور میں کچھ عرصہ کے لئے سگرٹ پینے کی لذّت سے محروم ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں نے دل ہی دل میں اُسے معاف کر دینے میں ہی اپنی بہتری سمجھی۔ اور دکان سے آگے بڑھ گیا۔

مَیں نے اندازہ لگایا کہ اگر سگرٹ پینے کے دوران میں کوئی معمولی یا غیر معمولی حادثہ نہ ہو جائے۔ تو یہ سگرٹ دس منٹ تک چل سکتا ہے۔ چنانچہ دس منٹ کے لئے مجھے ایک انتہائی پُرسکون جگہ کی ضرورت تھی۔ جہاں میں اس سگرٹ کے ساتھ پُورا پُورا اِنصاف برت سکوں۔

سڑک کے پہلو میں جہاں فٹ پاتھ مُڑتی ہے۔ ایک درخت کے نیچے مجھے سکون کے سائے بِکھرتے ہوئے نظر آئے۔ مَیں لپک کر درخت کے نیچے پہنچا۔ درخت کے نیچے ایک کوڑھی فقیر بڑے اطمینان سے اور بلا وجہ مُنہ کھولے سویا ہُوا تھا۔ گودڑی، ڈنڈا، ٹین کا ایک کٹورا، اور دو تین دوسری مبہم سی چیزیں رکھ کر اُس نے سر کے نیچے گاؤ تکیہ بنا رکھا تھا۔

"اس کی نیند میں خلل نہیں ڈالنا چاہیئے۔" مَیں نے مہذب آدمی کی طرح سوچا۔ اور اپنے چلتے ہوئے سانس روک لئے اور دبے پاؤں چل کر ایک اینٹ پر بیٹھ گیا۔ اگر درخت کے نیچے ایک صوفہ سیٹ پڑا ہوتا۔ تو مَیں یہ ٹوٹی پھوٹی اینٹ نیچے رکھ کر کبھی نہ بیٹھتا۔ پھر کیف اینٹ کی یہ نشست مجھے بے حد غنیمت معلوم ہوئی۔

مَیں نے شکھ کا سانس لیا۔ جیب سے سگرٹ نکالا۔ ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ سوائے مکھیوں کی بھن بھناہٹ کے جو فقیر کے زخموں کے گرد جارحانہ رقص کر رہی تھیں، اور کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ مَیں نے سگریٹ کو ماچس کی ڈبیہ پر ایک ہلکا سا ٹھوکا دیا۔ ننھا سا خوبصورت شعلہ لہرایا۔ اور .....

"بابو! ایک سگرٹ مجھے بھی دینا!"

شاید فقیر کی آواز آئی۔ ثابت ہُوا کہ یہ صاحب جھوٹ موٹ ہی سوئے ہوئے تھے۔ شعلہ بجھ گیا۔ مجھے خفیف سا غصّہ آیا۔ غصّہ پی جانے کی بظاہر کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ اِس لئے مَیں نے جھڑکتے ہوئے اُسے کہا: ——

"مَیں یہ سگرٹ خود پیوں گا۔ میرے پاس دوسرا سگرٹ نہیں ہے۔ اور اگر ہوتا بھی۔ تو مَیں تمہیں یہی کہتا کہ اپنا سگرٹ لے آؤ۔ مَیں تمہارے باپ کا دِیا نہیں کھاتا۔ سمجھے تم؟ سمجھ گئے کہ نہیں!؟"

فقیر نہ پریشان ہُوا۔ نہ اُداس۔ اس میں سمجھ سکنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اُس نے فقیرانہ عادت کے طور پر کہا ——

"پرماتما کے نام پر سگرٹ پلا دو۔"

" دیکھو مسٹر! پرماتما کا نام لے کر مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش مت کرو۔ اور مجھے آرام سے بیٹھ کر سگرٹ پینے کے لئے کھلا چھوڑ دو۔ ورنہ دوسری صورت میں اپنا بوریا بستر اُٹھا کر کسی دوسرے درخت کے نیچے چلے جاؤ۔"

فقیر نے دونوں باتیں ماننے سے انکار کر دیا۔ اور دلیل یہ پیش کی۔ کہ مکھیاں اُس کے زخموں کو اور بھوک اُس کی آنتوں کو اور کنکریاں اُس کی پیٹھ کو بے حد تنگ کرتی ہیں۔ اس لئے نیند کی کوشش کرنا بے سُود ہے اور کسی دوسری جگہ وہ اُٹھ کر اس لئے نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ عرصہ پانچ سال سے اس درخت کے نیچے سکونت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے ـــــــ

مسئلہ واقعی مشکل تھا۔ لیکن میں نے فوراً ایک تجویز پیش کی۔

" تم اتنا تو کر سکتے ہو۔ کہ اپنا منہ پھیر کر بیٹھ جاؤ اور دس منٹ تک خاموش رہو!"

" ہاں یہ کر سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے ایک سگرٹ دے دو۔"

" کوئی غیر مشروط بات کرو!"

" ـــــــ جیتے جی یہ ناممکن ہے۔"

" مان جاؤ جانی! میں تمہارے لئے ایک کوڑھی خانہ کھلوانے کی تحریک شروع کرواؤں گا۔ لیکن تم مجھ سے سگرٹ مت مانگو۔ کیونکہ اس سے میرا موڈ خراب ہوتا ہے اور میرے پاس کوئی دوسرا سگرٹ بھی نہیں اور نہ دوسرا آنہ ہے۔ دوست! تم سے بھلا کیا پردہ ہے۔"

" تو پھر یہی ہاتھ والا سگرٹ دے دو۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میری خواہش کا احترام بالکل نہیں ہے۔"

"اگر میں احترام کروں تو کیا تم مجھے سگریٹ دے دوگے؟"

"شاید نہیں ـــــ یقیناً نہیں!!"

فقیر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ شاید وہ ناراض ہوگیا۔ یا شاید اُسے غصہ آگیا۔ کیونکہ بے ساختہ اُس کا ہاتھ اُس کے ڈنڈے پر جا پڑا ـــــ یہ میں نے بعد میں سوچا کہ ڈنڈے پر اُس کا ہاتھ مکھیوں کو ہٹانے کے سلسلے میں جا پڑا تھا۔ لیکن بعد کی سوچ پر غرور کرنا بے ہودہ پن ہے۔ کیونکہ اُس وقت تو میں بے تحاشا بوکھلا گیا تھا۔ یہ شخص ڈنڈے سے ابھی ابھی میرا سر پھوڑ دے گا۔ اور پھر شاید میں سگریٹ پینے کے قابل ہی نہ رہ سکوں ـــــ میں نے سگریٹ فوراً جیب میں رکھا۔ اور ایک محاورے کے مطابق سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اگر فقیر چاہتا تو میری بزدلی اور اپنی فتح پر پیچھے سے قہقہہ بھی لگا سکتا تھا۔ لیکن یہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس وقت کسی قسم کے قہقہہ کی آواز کم از کم میرے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔

میں کئی منٹ تک ہانپتا رہا اور چلتا رہا۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی ہنسی آئی کہ میں بجلی کے کسی کھمبے سے کیوں نہیں ٹکرایا۔ حالانکہ ٹکرانے کے لئے گھبراہٹ سے زیادہ نادر موقع اور کوئی نہیں ہوتا۔ پھر بھی یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ خواہ مخواہ لوگ اکٹھے ہو جاتے اور میں شاید آدھے گھنٹہ تک اُس بھیڑ سے یہ بھی نہ کہہ سکتا کہ ہٹ جائیے ـــــ مجھے سگریٹ پینا ہے۔

تانگے اور رکشائیں کافی تعداد میں گذر رہی تھیں اور لطف یہ کہ ان میں سے

کئی ایک بالکل خالی تھیں۔ اور میں کسی بھی تانگہ یا رکشا میں بیٹھ کر بڑے اطمینانِ قلب کے ساتھ سگریٹ پی سکتا تھا ـــــــ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ میں کسی بھی تانگے یا رکشا والے کو اشارہ دے کر کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے میں نے صرف بطور مشق سے ایک تانگے والے کو اشارہ ضرور کر دیا۔ ظاہر ہے کہ میں صرف اپنا امتحان لینا چاہتا تھا کہ میرے اندر تانگہ والے کو اشارہ کرنے کی صلاحیت کہیں ختم تو نہیں ہو گئی؟

مگر تانگے والا واقعی کھڑا ہو گیا۔ اب خواہ مخواہ ندامت اٹھانے کا موقع تھا۔ اور قدرے شرمندہ ہونا بھی فطری تھا۔ لیکن مجھے یہ اعتماد ضرور تھا کہ میں تانگے والے کو بڑی صفائی سے ٹال سکتا ہوں۔ میں نے کھنگار کر گلا صاف کرتے ہوئے بڑی رعونت سے کہا۔

" شام نگر چلو گے؟ "

" جی نہیں! گیارہ بجے سے ہماری ہڑتال شروع ہو رہی ہے۔ اور اسو قت اسٹیشن کی گھڑی میں صرف چند منٹ باقی رہتے ہیں۔ "

میں نے بُرا سا منہ بنا لیا ـــــــ " تم لوگ ہڑتالیں کر کر کے شہری زندگی کا ستیاناس کئے دیتے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اب دیکھو۔ کیا میں شام نگر پیدل جاؤں گا اور اگر میں پیدل گیا بھی۔ تو پورا ایک گھنٹہ لگ جائے گا اور کلکتہ سے جو بیوپاری آیا ہے۔ وہ چلا جائے گا۔ اور مجھے کم از کم ڈیڑھ ہزار روپے کا جو منافع ملنے والا ہے۔ وہ نہیں ملے گا اور ادھر تم لوگ ہو کہ بات بات پر ہڑتال ...... "

"تانگے والا شاید میرے پہلے فقرہ پر ہی گھوڑا ہانک کر دُور نکل گیا تھا۔ یہ اچھا ہُوا کہ مجھے زیادہ دیر تک اپنا بنا ہُوا لیکچر جاری نہیں رکھنا پڑا۔ کیونکہ سگرٹ پینے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اپنا قیمتی وقت مَیں خود کبھی ضائع نہ کروں۔

اب مَیں بازار کے سرے پر بنے ہوئے دروازے کی ٹیک لگا کر یہ سوچ رہا تھا کہ سگرٹ پینے کے لئے موزوں جگہ کونسی ہو سکتی ہے۔ میری سوچ کافی واضح ہو رہی تھی۔ اگر مجھے یونہی ٹیک لگائے دو منٹ بھی اور مل جاتے تو کم از کم مَیں اپنے ذہن میں کسی موزوں جگہ کا ضرور تعیّن کر لیتا۔ لیکن اچانک کسی نے تیزی سے میری کلائی پکڑی اور میرے پورے جسم کو بڑے وحشیانہ طریقہ پر دروازہ سے گھسیٹ لیا اور کہا ——— "مرنے کا ارادہ ہے کیا؟ دیکھتے نہیں سامنے سے پہاڑ ایسی بھر کم بس آ رہی ہے اور وہ اس دروازے سے گھسیٹ کر ہی آگے نکلے گی۔ اور تم خوا مخواہ کچلے جاؤ گے۔؟ ———"

مَیں نے اُس کا شکریہ ادا کرنا بے معنی سمجھا۔ اس شخص کو خود سوچنا چاہیئے تھا کہ بس کا راستہ کھُلا کرنے کا یہ وحشیانہ طریقہ قطعی موزوں نہیں۔ بلکہ اس کی بجائے رائے عامہ کو بیدار کرنا چاہیئے۔ اور سب سے زیادہ تو اُسے یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ سگرٹ پینے کے لئے جو موزوں جگہ میرا ذہن قریب قریب طے کرنے ہی والا تھا وہ ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھی۔

کاش! مَیں غیر مہذب ہوتا۔ تو اس شخص کے سر پر دو دھول جما دیتا۔ تاکہ اسے وحشیانہ پن کی سزا مل جاتی۔ اور آئندہ ایسی حرکت کرنے سے پہلے ضرور سوچتا کہ جب تک بس زخمی کر کے گذر نہ جائے کسی مہذب آدمی کو یوں گھسیٹنا

نہیں چاہیئے۔

اب مجھے کوفت ہونے لگی۔ لیکن کوفت کوئی نفع بخش چیز نہیں تھی۔ بہرکیف چلنا ضروری تھا۔ سامنے اسٹیشن کا مسافر خانہ تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں مسافر خانہ کی طرف جانے کی بجائے کسی اور طرف نکل جاؤں۔ نظر اُٹھا کر میں نے مسافر خانہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مسترد کر دیا۔ آنکھیں اُٹھیں تو سامنے سے گزرتے ہوئے کشوری پر پڑ گئیں۔ میری شریف اور مہذب حس نے کہا۔ اِس سے کنی کترا کر نہیں گذرنا چاہیئے۔ کیونکہ کشوری نے اگر کنی کترا کر نکلتے ہوئے مجھے دیکھ لیا۔ تو بڑی غلامانہ قسم کی شکایت کرے گا اور یہ شکایت شاید مجھے اتنا کمزور کر دے کہ میں گھنٹہ بھر تک اس سے دامن نہ چھڑا سکوں۔ چنانچہ میں آفیسو پر آ گیا۔ اور بڑی پھرتی سے لپک کر اُسے جا لیا اور کہا۔

"دیکھو کشوری! تم ایک منٹ تک مجھ سے باتیں کر سکتے ہو۔ اس کے بعد چلے جانا۔ کیونکہ مجھے سگرٹ پینا ہے اور مجھ سے کوئی نئی کتاب بھی پڑھنے کے لئے طلب نہ کرنا۔ پھک منگے کہیں کے! مطالعہ کا اتنا ہی چسکا ہے۔ تو روپے کماؤ روپے! اور کتابیں مول لے کر پڑھا کرو۔ سمجھے تم؟ میرا مطلب ہے سمجھ گئے کہ نہیں! ——— اور بس! اب ایک منٹ گذر گیا ہے۔ اب تم جاؤ۔ اور مجھے سکون اور اطمینان کی کوئی جگہ تلاش کرنے دو۔"

کشوری ندامت کی ہنسی ہنسا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے بم کے گولے کی طرح اُس پر پھٹ پڑا ہوں۔ اور وہ اب کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہے۔ شلغم پر سے مٹی کریدنے کے انداز میں بولا۔ "میری بڑی بہن کو نمونیہ ہو گیا ہے۔ میں نے

تمہاری دو کتابیں بیچ دی ہیں۔ اور اُن سے دوائی لے کر آرہا ہوں۔ اگر تمہیں یہ بات بُری لگی ہے۔ تو مَیں یہ سمجھوں گا کہ نمونیہ کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے ۔"

آخری فقرہ توہین انگیز تھا۔ مَیں نے آنکھیں نکالیں۔ اُس نے آنکھوں سے آنسو گرا دیئے۔ مَیں نے اُن آنسوؤں سے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اگر قبول کر لیتا۔ تو اُس کے ساتھ مزید ہمدردی کرنا پڑتی۔ اُسے اپنے گھر لے جا کر دو کتابیں اور دینا پڑتیں اور اُسے کہنا پڑتا کہ انہیں بھی بیچ کر کل کے لئے دوائی لے آؤ ——— چنانچہ اثر نہ ہونے کا یہ فائدہ ہُوا کہ اُس نے مجھے بے رحم سمجھا اور اپنی راہ لگ گیا سگرٹ پینے کے لئے بے رحمی کا تیر نشانے پر بیٹھا۔

اگر پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر یہ سگرٹ پیا جائے۔ تو خاصا رومانٹک رہیگا" مَیں نے سوچا۔" ہو سکتا ہے۔ گیٹ کیپر کسی بھی وجہ سے مجھ سے پلیٹ فارم ٹکٹ طلب نہ کرے۔ یہ پلیٹ فارم ٹکٹ بھی عجیب وغریب چیز ہے۔ بالکل واہیات!"

نہ جانے کب اور کیسے مجھے یقین ہو گیا کہ گیٹ کیپر ٹکٹ مانگ کر مجھے ضرور رسوا کر دے گا۔ یہ مُفت کی رسوائی قبول کرنا بھی پلیٹ فارم ٹکٹ کی طرح کتنی واہیات چیز ہے ——— مسافر خانہ کے سبھی بنچ بھرے ہوئے تھے۔ بنچ اگر خالی ہو۔ اور اُس کا آخری کونہ بیٹھنے ہی نہیں بلکہ سونے کے لئے بھی مل جائے۔ اور پھر سگرٹ سُلگا لیا جائے۔ اور پھر اس کا پہلا کش لگایا جائے اور پھر . . .

یکایک مجھے یوں لگا۔ جیسے میرے پہلو سے کوئی چیز پھسل کر نیچے گر رہی ہے۔ میرا ہاتھ بے ساختہ میرے پہلو کی طرف گیا۔ میرے کوٹ کی جیب میں سے میری چھوٹی سی نوٹ بُک نیچے گر پڑی تھی۔

یہ کیونکر نیچے تشریف لے گئی ——— میرے اس سوال کا جواب دینے کے کوٹ کی جیب نے کہا۔ "جیب کٹ گئی۔"

جیب بلیڈ سے کاٹی گئی تھی۔ جیب کترا بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا تھا — جو چند فٹ کے فاصلہ پر شرم اور ڈر کے مارے منہ چھپائے تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے نہیں بھاگا۔ بھاگنا بالکل فضول تھا۔ یہ فرض ریلوے کے ایک کنسٹیبل نے ادا کیا۔ اور اس نے چند قدم پر جا کر ایک کونے میں لڑکے کو جا لیا۔ لڑکے نے دونوں خالی ہاتھ ہوا میں نچائے اور اسے بتایا کہ کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ سالا بالکل "فقرا" نکلا۔ کنسٹیبل اداس ہوگیا۔ اور اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اداسی اور واضح ہوگئی کچھ بھی نہ نکلا۔ صرف نوٹ بک ہی تو تھی۔ جو اس وقت لڑکے کے پاس نہیں۔ بلکہ میرے پاس تھی۔

ہنسی کا مقام تھا لیکن میرا دل رو دیا۔ جی چاہا۔ سپاہی سے جا کر کہہ دوں "حوالدار جی! اس لڑکے سے مجھے دو پیسے مزید دلوا دو۔ جیب کی سلائی کے لئے درزی دو پیسوں سے کم کیا لے گا؟" ——— لیکن پھر میں نے سوچا کہ اتنی گراوٹ پر نہیں اترنا چاہیئے۔ اس بدعنوانی کا قلع قمع کرنے کے لئے اسمبلی میں سوال اٹھوانا چاہئے چنانچہ اس سنگین معاملہ کو اسمبلی کے آئندہ سیشن پر ملتوی کر کے میں مسافر خانہ سے باہر آگیا۔ اس مسافر خانہ میں نوگرہ کٹ اور چور ڈاکو گھومتے ہیں۔ کون جانے۔ کسی کا بلیڈ اس بار میرا سگرٹ ہی اڑا کر لے جائے۔ اپنی چیز کی حفاظت کرنا ہر سمجھدار انسان کا فرض ہے۔

اب میں اس ماحول سے نہایت تیزی کے ساتھ کہیں نکل جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ

میں تیز تیز ڈگ بھرنے لگا۔ ڈگ پر ڈگ۔ ڈگ پر ڈگ۔ ایک بازار سے دوسرے بازار۔ دوسرے سے تیسرے۔ پھر ایک گلی میں، پھر ایک سڑک پر۔ ایک چوراہے سے گزرتا ہوا، ایک باغ میں سے ہوتا ہوا ——— میں نے سول لائنز کی ایک خوبصورت سی کوٹھی کے سامنے جا کر دم لیا۔ یہاں لوگوں کی آمد و رفت قریب قریب بالکل نہیں تھی۔ آرام اور سکون کی ایک خوشگوار فضا تھی۔ صرف درخت ہل رہے تھے۔ جو یقیناً سگرٹ نہیں پیا کرتے اور سگرٹ پینے میں متحمل ہونے کی عادت سے تو بالکل محروم ہیں کوٹھی کے باہر کھڑے ہو کر سگرٹ پیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ مجھے کچھ معیوب سا لگا۔ اگر کوٹھی کے اندر چلا جائے۔ تو کوٹھی کا معزز مالک مجھے بڑی عزت کے ساتھ ایک الگ کمرہ دے سکتا ہے۔ تاکہ میں دس منٹ میں اپنا سگرٹ ختم کر کے بغیر کوئی چیز چوری کئے واپس چلا آؤں۔ چنانچہ اس جمہوری شعور میں ڈوب کر میں اندر چلا گیا۔ اور برآمدے میں جا کر سب سے پہلے کمرہ میں گھس گیا۔

قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی ایک گل اندام حسین لڑکی اپنی زلفیں سنوار رہی تھی۔ میں نے بے تکلف ہو کر کہا ———

"آپ مجھے وہ کمرہ دکھا دیجئے۔ جہاں بیٹھ کر میں اطمینان سے سگرٹ پی سکوں"

لڑکی قاتل کٹار کی طرح لہرا اُٹھی اور بولی۔

"میں اس صوبہ کے بہت بڑے افسر کی بیٹی ہوں۔ میرے پاس پندرہ کمرے ہیں۔ آپ کی جیب میں کیا ہے؟"

"ایک سگرٹ۔"

"لیکن مجھے تو عطر اور لونڈر چاہیئے۔ بالوں میں لگانے کے لئے ربن اور گلے میں پہننے کے لئے ہار چاہیئے۔"

"آپ اپنے مطالبات کے لئے جدوجہد کریں اور اتنی دیر میں مجھے سگرٹ پینے دیں۔"

"لیکن اُس وقت تک تم سگرٹ کیسے پی سکتے ہو۔ جب تک ہم اپنی چوتھی کار نہ خرید لیں۔ یہ دیکھو۔۔۔۔۔" اُس نے ایک امریکی میگزین اُٹھایا۔ اور مجھے دکھاتے ہوئے بولی۔

"بالکل نئے ماڈل کی کار ہے۔ میرے والد بزرگوار نے بمبئی کی ایک فرم کو اس کار کا آرڈر بھیج دیا ہے۔"

"لیکن محترمہ! کار اور سگرٹ دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان دونوں کی کمپنیاں الگ الگ ہیں۔ نوعیت جُدا جُدا ہے۔ اس لئے ——— آپ کسی غلط فہمی کا شکار معلوم ہوتی ہیں۔"

معاف کیجئے۔ کل جو ریشمی ساڑھی کا جوڑا لائی ہوں۔ ایسا ہی ایک اور جوڑا مجھے اگلے ہفتہ بھی خریدنا پڑے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ پیرس جانے سے پہلے پہلے میں کم از کم بیس نئی ساڑھیاں ہمراہ لے جاؤں۔ دہلی میں مقیم فرانسیسی سفیر نے ایک کاک ٹیل پارٹی میں میرا بوسہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ڈیئر شیلا! تم اگر پیرس میں جاؤ۔ تو تمہاری ساڑھیوں کے اعزاز میں فرانسیسی وزارت مستعفی ہونے پر تُل جائے گی۔ سمجھے تُم۔ سمجھ گئے کہ نہیں؟"

چونکہ وہ مادری زبان میں بات کر رہی تھی۔ اس لئے میں سمجھ گیا۔

لیکن فرانسیسی وزارت کے اس استعفیٰ پر مجھے کیا اختلاف ہو سکتا تھا۔ آخر مجھے ایک سگرٹ ہی تو پینا تھا۔ کوئی بین الاقوامی تصفیہ تو کرنا ہی نہیں تھا۔ یہ لڑکی خواہ مخواہ بال کی کھال نکال رہی ہے۔ مجھے صاف صاف اسے بتا دینا چاہئے کہ تمہارے والد بزرگوار کے خلاف جب عدم اعتماد کا ریزولیوشن پیش ہوگا۔ تو میں غیر جانبدار رہوں گا۔ اس لئے وہ مجھے سگرٹ پینے کے لئے کمرہ دکھا دے۔

"بات یہ ہے جی۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی لڑکی میرے بالکل قریب آکر کہنے لگی۔

"میرے والد بزرگوار نے میری ساڑھیاں خریدنے کے لئے اس مہینے کچھ نئے ٹیکس لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان ٹیکسوں میں سگرٹ پینے پر ٹیکس بھی شامل ہے۔ اس لئے آپ ملک کی صنعتی ترقی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ٹیکس دے دیجئے۔ اور پھر بڑے مزے سے بیٹھ کر سگرٹ پیتے رہئے۔ ورنہ دوسری صورت میں پولیس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مجھ پر پولیس کے بھوت کی بجائے سگرٹ پینے کا بھوت سوار تھا۔ اس لئے میں نے اندھا ہو کر کہا۔ "کتنا ٹیکس دینا پڑے گا مجھے۔"

"ایک سگرٹ پر ایک آنہ!"

"یعنی اگر ایک آنہ والا سگرٹ پیا جائے۔ تو ایک سگرٹ پر ایک سگرٹ ٹیکس یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

"بالکل! بالکل!! آپ حساب میں کافی ماہر معلوم ہوتے ہیں۔"

"بالکل! بالکل!! کیونکہ میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔"

"تو پھر نکالئے۔"

"کیا؟"

"ایک آنہ"

"ایک آنہ تو میرے پاس نہیں ہے محترمہ! اس لئے آپ یوں کیجئے۔ کہ آپ مجھے سگرٹ پینے دیجئے۔ اور میں ایک مہذب آدمی کی طرح یہاں سے جاتے ہی آپ کو ایک آنہ ٹیکس بھجوا دوں گا۔ بس یوں سمجھئے کہ آپ کا ایک آنہ مجھ پر قرض رہا۔"

"مگر قرض محبت کی توہین ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کو سگرٹ پینے سے پہلے ہی ٹیکس دینا پڑے گا۔"

میں کشمکش میں پڑ گیا۔ نوجوان حسینہ کی پوزیشن بالکل واضح تھی۔ وہ ایک سیدھے سادے اصول پر عمل کروانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ میری پوزیشن بھی واضح تھی۔ کہ اگر میں ایک آنہ ٹیکس نہیں دیتا۔ تو سگرٹ نہیں پی سکتا۔ اور اگر سگرٹ پیتا ہوں۔ تو ایک آنہ دینا پڑے گا۔ جو میرے پاس موجود نہیں ہے ـــــ میرے ذہنی تذبذب کو شاید وہ نوجوان حسینہ بھانپ گئی ـ یہ کوٹھیوں اور کاروں والے انسانی نفسیات کے کتنے ماہر ہوتے ہیں۔ بولی ـــ

"میں آپ کی پوزیشن سمجھ رہی ہوں۔ مگر حیرت ہے کہ آپ اتنے سیدھے سادے مسئلہ کو بھی حل نہیں کر سکتے۔ آپ کے پاس ایک سگرٹ موجود ہے۔ جس کی قیمت ایک آنہ ہے۔ گویا دوسرے معنوں میں آپ کے پاس ٹیکس دینے کے لئے ایک آنہ موجود ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ مشکل حل ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً سگرٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسے لے کر یہ کہتے ہوئے وہ دوسرے کمرہ میں چلی گئی کہ آپ قانونی

طور پر سگرٹ پینے کے لئے آزاد ہیں۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

حسینہ چلی گئی اور اُس کے جانے کے دو سیکنڈ بعد ہی مجھے یکدم احساس ہُوا۔ کہ سگرٹ پینے کی آزادی حاصل کرنے کے بعد میری پوزیشن یہ ہے کہ میرے پاس وہ سگرٹ ہی نہیں جسے میں پی سکوں۔

صورت حال کی اس ڈرامائی تبدیلی پر میں مُسکرا دیا۔ اور سامنے کھڑکی سے نظر آتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی کی بغل میں ایک بڑے سے موٹے کاغذ کے تختے پر سُنہرے حروف میں لکھا ہُوا تھا۔

"ہمارے دیش کے ہر باشندے کو انفرادی آزادی کا حق ہے۔"

قمیص دان تحریک

یہ شری " دھان پان دھاگے " کی کہانی ہے ۔ یہ کہانی آج مجھے اس لئے یاد آرہی ہے ۔ کیونکہ آج میری قمیص پھٹ گئی ہے ۔

جب بھی میری قمیص پھٹتی ہے ۔ تو شری دھان پان دھاگے ایک سوئی دھاگے کی طرح میرے ذہن کے اُفق پر نمودار ہو جاتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں ۔

دان دیئے دھن نہ گھٹے . . . .

کیا شری دھاگے کوئی ٹیلر ماسٹر تھے یا کسی ہوزری فیکٹری کے مینجر تھے یا ---- نہیں ایسا نہیں ہے ۔ کیونکہ بھگوان نے انہیں دُنیا کے مسائل حل کرنے کے لئے پیغمبرانہ طاقتیں دے کر بھیجا تھا ۔ وہ دھان کی طرح سوکھے تھے ، پان کی طرح کسیلے تھے اور دھاگے کی طرح پتلے تھے ۔ ان کا چہرہ دیکھ کر بھگوان کی قدرت

یعنی خزاں یاد آجاتی تھی۔ مونچھیں غائب تھیں، سر کے بال غائب تھے۔ بولتے تھے تو الفاظ غائب ہو جاتے تھے، چلتے تھے تو نظروں سے غائب ہو جاتے تھے گویا ع

مزاج ان کا لڑکپن سے غائبانہ تھا

ذات کے برہمن تھے اور پات کے کرایہ دلیہ ــــــ یعنی لالہ دھنپت رائے سمپت رائے، گنپت رائے سوداگرانِ جمادات و نباتات و حیوانات کی بلڈنگ میں دوسرے گیارہ کرایہ داروں کے ساتھ ایک کرایہ دار کی حیثیت میں رہتے تھے پیشہ یہ تھا کہ بھگوان کا بھجن کیا کرتے تھے۔ اور کرایہ داروں کو اُپدیش دیا کرتے تھے کہ تجھُ جیون ایک واہمہ ہے۔ مُنش پاپی ہے اور کرمن کی گت نیاری ہے۔ جو نہ آج تک کسی نے ٹاری ہے اور نہ مستقبل قریب میں ٹرے گی۔ اِس لئے اے پرانی ماترو یعنی کرایہ دارو! کرایہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو دیدیا کرو اور اے دھنپت رائے سمپت رائے! تم بھی ہر پہلی تاریخ کو یہ کرایہ لے لیا کرنا۔ لڑائی جھگڑا اچھی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے چوٹیں آجائیں گی اور مُنکچر آیوڈین لگانا پڑے گا۔ شور و غل مت مچاؤ۔ کیونکہ اس سے بلڈنگ کی چھت پر لگا ہُوا سیٹھ دھنپت رائے سمپت رائے کے ریڈیو کا ایریل گر جائے گا اور ان کا فلپس کا قیمتی ریڈیو گھرڑ گھرڑ کرنے لگے گا۔ اگر تم میں سے کسی کے سینے میں کوئی ہوک اُٹھے تو اپنے سینے کا سوئچ آف کردو اور اگر اسے بخوبی آف نہ کرسکو تو پھر سیٹھ دھنپت رائے سمپت رائے کے دروازے پر جا کر دستک دو۔ تاکہ وہ تمہیں پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس پلا کر شانتی پردان کر سکیں۔

سیٹھ گنپت رائے سمپت رائے نے ایک دن مجھے کہا کہ شری دھان پان دھاگے کا سٹائل آف ورک خالص روحانی ہے۔ میں نے سیٹھ گنپت رائے سمپت رائے کو بتایا کہ روح ہوائی چیز ہے مگر آپ کی بلڈنگ ٹھوس چیز ہے اور شری دھان پان جی ان دونوں ہوائی اور ٹھوس چیزوں کے درمیان دھاگے کی طرح لٹکے ہوئے ہیں۔ وہ دھاگے کا ایک پُل ہیں۔ جس پر سے صرف روحوں کا ٹریفک جاری رہ سکتا ہے۔ مگر ٹھوس چیزوں کا ٹریفک شروع ہوتے ہی پُل ہمیشہ کے لئے بند ہے لا کا بورڈ لگ جاتا ہے۔

مگر پُل کی یہ قسم سیٹھ گنپت رائے سمپت رائے کی سمجھ میں نہ آسکی۔

اور اسی بلڈنگ میں شری دھان پان دھاگے نے قمیص دان تحریک شروع کی۔ یہ تحریک اگرچہ اپنے ساتھ شری دھاگے کو بھی اُڑا لے گئی۔ لیکن اس تحریک کی آوازیں آج بھی اس بلڈنگ کی اینٹوں سے کبھی کبھی سُنائی دے جاتی ہیں اور ہم اس تحریک کے حق میں ایک آدھ ٹھنڈا سانس بھر لیتے ہیں۔

تحریک کا آغاز ایک چھوٹے سے سانحہ سے ہُوا ——— ایک دن صبح سیٹھ گنپت رائے سمپت رائے ناشتہ فرما کر باہر نکلے۔ تو اُنہوں نے ایک نئی اور لش لش کرتی ہوئی بادامی رنگ کی سلکن قمیص "نوش جان" کر رکھی تھی۔ سیٹھ جی کا بدن اگرچہ بھدّا تھا۔ سر گول تھا اور چہرہ گول تھا اور گردن گول تھی اور شانے گول تھے اور چار سُو پھیلے ہوئے ان "گولوں" نے انہیں گول مال بنا ڈالا تھا۔ پھر بھی یہ جھل جھلاتی قمیص ان پر عجب بہار دے رہی تھی۔

سیٹھ جی کے حسن کا یہ سٹائل دیکھ کر بلڈنگ کے ایک کرایہ دار مگم داس نے

سیٹھ جی کی قمیص کو گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ نگم داس جنم سے آج تک بغیر قمیص کے چلا آرہا تھا۔ اس کا ہڈیوں بھرا آبنوسی جسم بغیر قمیص کے نہائت نیچرل لگتا تھا۔ نہ صرف نگم داس اس نیچرل خوبی کا مالک تھا۔ بلکہ بلڈنگ کے گیارہ کے گیارہ کرایہ دار اپنی تخلیقی قوتوں یعنی بال بچوں کے ساتھ عہدِ وفا باندھے ہوئے تھے۔ اس لئے نگم داس کا سیٹھ دھنپت رائے سمپت رائے کی سلکن قمیص کی طرف یوں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کا مطلب صاف صاف یہی تھا کہ وہ اپنی نیچرل روایات کے پاؤں پر کلہاڑا چلا رہا ہے۔ چنانچہ سیٹھ جی نے اس کی اس اَن نیچرل حرکت پر بے حد بُرا منایا اور ناک پر رومال رکھ کر کہا ——— "تم میری قمیص کی طرف کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہو ——؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ قمیص کتنی حسین اور جاذب نظر چیز ہوتی ہے۔ نہ جانے ہمارے باپ دادا نے اپنی برادری میں قمیص کا رواج کیوں نہیں ڈالا تھا۔"

سیٹھ جی ہنس پڑے، پھر غصّہ ہو گئے اور پھر گرجنے لگے ——— "تمہیں شرم نہیں آتی بے نگم کے بچے! کہ بھگوان اور قدرت کے کئے کرائے پر پانی پھیر رہا ہے۔ قمیص بھگوان نے تمہارے لئے بنائی ہی تو پھر بادھا کیوں ڈالتے ہو؟"

نگم داس نے ڈرتے ڈرتے کہا ——— "سیٹھ جی! قمیص بھگوان تھوڑے بناتا ہے۔ قمیص تو درزی بناتا ہے۔"

سیٹھ جی کو شبہ ہُوا کہ نگم شاید اُنہیں درزی بنا رہا ہے۔ اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُنہوں نے نگم کے ایک چپت رسید کی۔ نگم بپھر اُٹھا۔ شور و غوغا سُن کر دوسرے کرایہ دار بھی آ پہنچے۔ سیٹھ جی سبھوں کو ایک ساتھ پیٹنے کے لئے لپکے۔ سارے کرایہ دار

نے اپنی اپنی آنکھیں نکالیں۔ جس پر سیٹھ جی بل کھاتے ہوئے اپنی دونالی اُٹھالائے۔ دونالی دیکھ کر سبھی سہم گئے۔ اور ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔

مگر نگم داس بدستور للکار رہا تھا ——— "میں کہتا ہوں ہم ننگے نہیں رہیں گے۔ اگر ہم ننگے رہتے ہیں تو پھر میرے اس سوال کا جواب دیا جائے کہ سیٹھ جی بھی ننگے کیوں نہیں رہتے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ سیٹھ جی کے پاس دُنیا جہان کی قمیصیں ہیں۔ نیلی قمیصیں۔ پیلی قمیصیں۔ لال قمیصیں۔ سفید قمیصیں سبز اور مٹیالی قمیصیں۔ ریشم اور لٹھے کی قمیصیں ——— اور ایک ہم ہیں کہ صدیوں سے بغیر قمیص کے چلے آرہے ہیں۔

سبھی کرایہ داروں کی آنکھیں پھر ایک بار سلکن قمیص پر جم گئیں — اور للچاہٹ کے اِن تیروں نے سیٹھ جی کا کلیجہ پھر چھلنی کر دیا۔ اور اُنہوں نے فوراً دونالی کا مُنہ نگم کی طرف کر دیا۔

اور اس سے پہلے کہ دھماکا ہوتا اور نگم اپنے سوال کا اصلی جواب پا جاتا۔ پیچھے سے آکر شری دھان پان دھاگے نے سیٹھ جی کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ایک شعر پڑھتے ہوئے بولے۔

؎ دیا دھرم کا مول ہے پاپ مول ابھیمان
تلسی دیا نہ چھوڑیئے جب لگ گھٹ میں پران

اور پھر سیٹھ جی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"آپ اِن جیو جنتوؤں کو کیوں مارتے ہیں دیا وان جی!"

"یہ میری قمیص کو بُری نظروں سے دیکھتے ہیں شریمان جی!"

"یہ ان کی مورکھتا ہے۔ تمش جنم جنم سے پاپی ہے۔ لوبھ اور دولت نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ سیٹھ جی! آپ تو ایشور ہی کا روپ ہیں اور باقی سبھی بہروپ ہیں۔ اس لئے کرودھ کرنا آپ جیسے مہاپرش کو شوبھا نہیں دیتا۔"

یہ اُپدیش پانی کے گھڑے کی طرح سیٹھ جی پر پڑ گیا۔ اور انہوں نے شری دھان پان دھاگے کے سر پر سے مکھیاں اڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے کہنے پر انہیں چھوڑے دیتا ہوں۔ لیکن انہیں سمجھا دیجئے کہ اوّل تو بغیر قمیص کے ہی زندگی کاٹنے کی کوشش کریں اور اگر قمیص کے بغیر ان کا دل فیل ہو جاتا ہے تو مارکیٹ سے جا کر اپنی قمیص خرید لائیں۔ لیکن میری قمیص ۔۔۔۔۔۔؟"

یعنی بات صاف تھی۔ قمیص جب مارکیٹ میں ہر نرخ پر مل جاتی ہے تو یہ لوگ سیٹھ جی اور اس کے کنبہ کی قمیصوں پر کیوں دانت گاڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایک سماجی ناانصافی کا ارتکاب کرنا ہے۔ چنانچہ سیٹھ جی جب اپنی ہدایت دے کر کار پر بیٹھ کر چلے گئے تو شری دھان پان دھاگے نے نگم داس کو قریب بلا کر کہا۔

"دیکھو نگم بیٹے! قمیص پہنے بغیر آدمی مر نہیں جاتا۔ اب میری طرف دیکھو میں خود بغیر قمیص کے زندہ رہتا ہوں اور اگر کبھی بدن ڈھانکنے کا خیال آ جاتا ہے تو بدن پر راکھ مل لیتا ہوں۔ لیکن یہ تُو تُو مَیں مَیں تو اچھی چیز نہیں ہے اس سے سماج میں ناانصافی جنم لیتی ہے۔"

نگم بولا۔" شری دھاگے جی! آپ کے جسم کی اور بات ہے۔ اس پر لاکھ زیب دے جاتی ہے۔ مگر ہم نورا کھ مل کر بھوت معلوم ہونے لگیں گے ....."

" بھوت پریت تو ہر منش کے اندر موجود ہے نگم بیٹا! یہ تو مرتیو سے پہلے نکلنے کے نہیں۔ مگر اس لنگوٹی قمیص پر یہ ذنگا کرنا ہمارے ایسے نیک اور شریف آدمیوں کو جچتا نہیں۔ آخر تم سیٹھ جی کی اس تجویز کو کیوں نا پسند کرتے ہو کہ مارکیٹ سے جا کر قمیص خریدنی چاہئے۔ پرائے دھن پر آنکھ رکھو گے تو لوگ باگ چور لٹیرا کہیں گے۔ کہیں گے نا؟"

" چور ڈاکو تو سیٹھ دھنپت رائے ہے۔ جس نے سینکڑوں قمیصیں اپنی الماریوں میں ٹھونس رکھی ہیں۔ ہمارے پاس پیسہ ہی کہاں ہے کہ بازار سے قمیص لے آئیں۔ بتائیے کہاں ہے پیسہ؟"

" یہ تو میں نہیں جانتا کہ پیسہ کہاں ہے؟ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پیسہ موہ مایا کا جال ہے۔"

" اور قمیص سیٹھ جی کے باپ دادا کا مال ہے؟"

شری دھان پان جی فوراً لپک کر اپنے کمرے میں گئے اور بڑی سی دھارمک پستک کندھے پر اٹھا کر لے آئے اور کہنے لگے ——————

" دیکھو بیٹا! ہمارے مہارشی بھد بھد بھگتن نے اس شاستر "دان، دان داننی" میں صاف صاف لکھا ہے کہ قمیص کا لوبھی آخر نرک میں جاتا ہے۔"

مگر نگم داس نے کورا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر قمیص پہننے سے سیٹھ جی تک نرک میں جائیں گے۔ تو ہم کوئی لاٹ صاحب نہیں ہیں کہ جانے سے

اِنکار کر دیں گے۔

بے قیمت کرایہ داروں کے یہ غضبناک تیور دیکھ کر شری دھاگے کا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور اُنہیں یوں لگا۔ جیسے ان کی ساری ایشور بھگتی ریاضت اور نفس کشی کی قیمت ایک قمیص اِتنی بھی نہیں ہے۔ "آہ!" وہ سوچنے لگے۔ "سارا جیون اکارتھ گیا۔ ساری بھگتی ایک قمیص سے چِت ہو گئی۔" چنانچہ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ رات بھر اپنے کمرے میں موم بتی کے سامنے روتے رہے۔ اور جب موم بتی پگھل کر دُنیا اندھیر کر گئی۔ تو ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے تاکہ ان کی زخمی آتما کی آواز سیٹھ گینت رائے سمیت رائے تک جا پہنچے۔ مگر سیٹھ جی چونکہ اس رات شراب زیادہ پی گئے تھے۔ اور مُرغی سالم کھا گئے تھے۔ اِس لئے خراٹوں کی نیند سو رہے تھے۔ البتہ شری دھاگے کی آواز پر گلی کا محافظ "بل ڈاگ" ایک آدھ منٹ کے لئے بھونکا تھا۔ مگر بعد میں شری دھاگے کی آواز پہچان کر اونگھنے لگ گیا تھا۔

دوسرے دن صبح اُٹھتے ہی شری دھان پان دھاگے نے سیٹھ جی سے ان کی بیٹھک میں ملاقات کی۔ اور کہنے لگے "سیٹھ جی! آپ کے پاس کتنی قمیصیں ہیں؟"

"آپ کون ہوتے ہیں پُوچھنے والے؟"

"آپ کا بھلا چاہنے والا۔"

"مجھے آپ کے بھلے کی کوئی ضرُورت نہیں۔"

"تو پھر آپ کے لئے بُرا ہو گا۔"

"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

دھمکی کا لفظ سن کر شری دھاگے کی ایک آنکھ میں آنسو آگیا۔ اور پھر اُنہوں نے آگے بڑھ کر سیٹھ جی کی پیشانی پر اپنا وہ آنسو ٹپکاتے ہوئے کہا:——

"آہ! سیٹھ جی! آپ کو تو اپنے پرائے کی بھی تمیز نہیں رہی۔ آپ نہیں جانتے کہ زمانہ بُرا آرہا ہے۔ اور وہ آپ کی سب قمیصیں چھین کر لے جائے گا اور پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ دھاگے کتنا بڑا جوتشی تھا؟ —— بزرگوں نے کہا ہے کہ سارا دھن جاتا دیکھئے تو آدھا دیجئے بانٹ۔ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ سبھی کرایہ دار بگڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ عقل سے کام لیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"بھلا آپ کے پاس کُل کتنی قمیصیں ہوں گی؟"

سیٹھ دھنپت رائے سمپت رائے نے یہ سُنا تو اُن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور پھر اُنہوں نے جوابی محبت کے طور پر شری دھاگے کی پیشانی چُوم لی۔ پیشانی کا پسینہ کھٹّا تھا۔ مگر سیٹھ جی نے اُسے شربت کے گھونٹ سمجھ کر حلق سے اُتار لیا۔ اور ایک سرد آہ بھر کر بولے۔

"شری دھاگے جی! آپ تو غیب کا علم جانتے ہیں۔ خود ہی گیان چکھشو سے دیکھ لیجئے کہ مجھ غریب کے پاس بھلا کتنی قمیصیں ہوں گی۔ شاستروں میں لکھا ہے کہ منش کو دِن میں پانچ بار قمیص بدلنا چاہئے۔ مگر یہاں صرف چار ہی بار بدلنے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ ملا جُلا کر یہی سوڈیڑھ سو ہی قمیصیں ہوں گی۔ اب بتائیے بھلا، ان قمیصوں سے نگی کیا نہائے گی اور

کیا نچوڑے گی؟"

یہ کہہ کر سیٹھ جی نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ شری دھاگے نے بطور ہمدردی اُن سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس بھری اور بولے۔ "کیا کیا جائے سیٹھ جی! انسانوں کی آبادی اتنی زیادہ ہے اور بھگوان نے دھرتی اتنی مختصر بنائی ہے کہ یہاں پوری قمیصیں اُگتی ہی نہیں۔ کیا کیا جائے بھگوان کی مایا اپرم پار ہے۔ قمیصیں تھوڑی اور انسان زیادہ ——— اس طرح بھگوان شاید مُلش مانو کی پریکشا کر رہا ہے۔ مگر آپ کو اِس پریکشا میں پُورا اُترنا چاہیئے۔ ورنہ بھگوان آپ سے ناراض ہو کر کہیں ڈنڈ نہ دے دے۔ وہ آپ کو ڈنڈ دے گا۔ مجھے ڈنڈ دے گا۔ کرایہ داروں کو ڈنڈ دے گا۔ یوں ایک خوا مخواہ کا شور مچ جائے گا۔ ہم سب کی رسوائی ہوگی۔ اس لئے میرا یہی مشورہ ہے آپ اپنی شردھا کے مطابق اپنی چند قمیصیں دان کر دیں اور ان کُتّے کرایہ داروں کے مُنہ میں ہڈی دے کر چُپ کرا دیں۔ آپ کے چھوٹے بھائیوں اور بچوں کے پاس بھی تو کچھ قمیصیں ہوں گی ہی ——"

سیٹھ جی نے اپنے نزدیک کھڑے ہوئے چھوٹے بچّے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اپنے اِس بچّے کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اِس بچے کے پاس یہی ایک قمیص ہے۔ جو اس نے پہن رکھی ہے۔ جب یہ میلی ہو جائے گی تو نہ جانے کیا پہنے گا؟"

یہ سُن کر شری دھاگے کے بدن میں جھرجھری آ گئی۔ "چھ چھ چھ! سیٹھ کا بچّہ ہو کر صرف ایک قمیص؟ اے بھگوان یہ انرتھ ہے۔ مہان انرتھ ہے۔

سیٹھ جی کے ان معمولوں نے آخر نیز کیا بگاڑا ہے کہ تو انہیں ایک قمیص تک نہیں دیتا۔ ایک طرف بیچارے کرایہ داروں کو قمیص نہیں دیتا۔ اور دوسری طرف سیٹھ جی کے بچے کو ننگا رکھتا ہے۔ آخر یہ تیرا کیسا انصاف ہے؟"

سیٹھ جی نے کہا۔ "انصاف کہاں ہے شری دھاگے جی! اب دیکھئے پچھلے سال ہماری فرم کو ڈیڑھ کروڑ کا منافع ہوا۔ مگر اس سال پچاس ہزار کم کا منافع ہوا۔ اگر انصاف برابر ہوتا تو کیا منافع برابر نہ ہوتا۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں شری دھاگے جی!"

"آپ اور جھوٹ! ——— رام رام کیجئے۔ اس دن زمین پاتال میں دھنس جائے گی۔ جس دن آپ کے منہ سے جھوٹ کا ایک شبد بھی نکلیگا ——— ہاں، تو پھر کیا آپ میری اس تجویز کو پسند کرتے ہیں۔ کہ آپ قمیص دان یگیہ شروع کر دیجئے۔ آپ کا جتنا جی چاہے۔ قمیصیں دان کیجئے اور کچھ قمیصیں اپنے بھائیوں، عورتوں اور بچوں کے ہاتھ سے بھی دان کرائیے۔"

سیٹھ چلا اٹھا۔ "تو کیا آپ میرے بچوں اور عورتوں کی قمیصیں بھی اتروا لیں گے؟"

"آپ اسے اتارنا مت کہیئے سیٹھ جی! کیونکہ اس سے میرے من کو ٹھیس لگتی ہے۔ آپ اسے دان کہیئے دان! ——— کیونکہ بے قمیص کرایہ داروں کا کہنا ہے کہ ان کے بھی بچے اور عورتیں ہیں۔"

"وہ بالکل جھوٹ کہتے ہیں۔"

"خیر۔ اس کی تحقیق کرلیں گے کہ ان کے بال بچے ہیں کہ نہیں۔ پھر بھی ایک برہمن آپ کے سامنے جھولی پھیلا رہا ہے۔ تو وہ چاہتا ہے آپ اس کی جھولی میں چند قیمتیں ڈال ہی دیں۔ بھگوان اس کے بدلے میں آپ کو ہزاروں قیمتیں دے گا۔"

"نہ جانے کب دے گا بھگوان؟ مگر اس وقت تو ہم سے لے ہی رہا ہے"

اس پر شری دھان پان ایک پھیکی سی ہنسی ہنسے اور سیٹھ جی ایک ٹھنڈا سانس بھر کر یہ بات مان گئے کہ وہ قیمتیں دان یگیہ آرمبھ کر دیں گے۔ شری دھاگے کا مشن کامیاب ہو رہا تھا اور چار گز کپڑے کی قسمت نے انسانوں کے بہتر تعلقات کے درمیان جو خلیج حائل کی تھی۔ اسے شری دھاگے نے دیا دھرم کی مٹی سے پُر کرنے کا سامان پیدا کر لیا تھا۔

چنانچہ وہ خوشی سے اُچھلتے کودتے نگم داس کے پاس گئے۔ اور سبھی کرایہ داروں کو اکٹھا کر کے یہ خوشخبری سُنائی ـــــ کہ اب عُریانی کا دخیانہ دَور ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے بجائے قیمتیں دان دَور کا آغاز ہو جائے گا۔

اسی دن شام کو شری دھان پان دھاگے دوڑے دوڑے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی والوں سے "کک" کا ایک خالی ڈرم مانگ لائے۔ اور اپنے کمرے کے دروازے پر لا کر ایک کونے میں رکھ دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ اسے یگیہ کُنڈ تصوّر کیا جائے اور سیٹھ جی اور اُن

کے کنبے کے افراد کے مَن میں جتنی شردھا اور دیا آئے وہ قیمتی دان کرتے ہوئے بطور سامگری اس ڈرم میں ڈالتے چلے جائیں۔ کرایہ داروں سے انہوں نے کہہ دیا کہ جب یہ یگیہ ختم ہوگا تو قیمتیں بانٹ دی جائیں گی۔ اس عرصے میں سیٹھ جی سے براہِ راست مطالبات بالکل نہ کئے جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

اور پھر قیمتیں ڈرم کنڈ میں ڈالی جانے لگیں۔ قیمتیں ڈالنے کی اِفتتاحی رسم سیٹھ گنپت رائے دھنپت رائے سمپت رائے کی ایک قمیص سے ادا کی گئی۔ اس قمیص کا ایک بازو غائب تھا۔ دوسرے بازو کے کف لٹک رہے تھے۔ دامن کا بایاں حِصّہ پھٹا ہُوا تھا۔ اور دایاں حِصّہ تیل اور گھی اور چٹنی سے چکٹ ہو چکا تھا۔ گلے کے بٹن سیٹھ کی دھرم پتنی نے اُتار کر اپنی پٹاری میں رکھ لئے تھے۔ اس قمیص کی صرف جیب سالم تھی۔ اور باقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ——— اور باقی "ہُوالشافی" ہو کر رہ گئی تھی۔

جب یہ قمیص آہوتی کے طور پر کنڈ میں ڈالی گئی۔ تو آسمان سے پھولوں کی بارش ہوئی۔ راجہ اِندر کی اپسراؤں نے گھنگروؤں کی تال پر بہار یہ سنگیت الاپا۔ اور شری دھان پان جی نے سیٹھ جی کو تِلک لگایا۔ ان کے مُنہ میں لڈّو بھرا۔ کسی کرایہ دار کو یگیہ کنڈ کے قریب نہیں آنے دِیا گیا۔ کیونکہ یگیہ کی پوتر تا بھنگ ہونے کا خدشہ تھا ———

دن پہ دن گذرتے گئے اور قمیصیں آتی گئیں۔ آنے کی رفتار ایک قمیص
فی دن سے آگے نہ ہی بڑھ سکی۔ اکثر اوقات اس رفتار میں بھی تعطیل آجاتی
پہلی قمیص کی کسوٹی پر پرکھ کر دوسری قمیصیں ڈالی جاتیں۔ اور کبھی کبھی کسوٹی
اور بھی "ڈرامائی" ہو جاتی۔ یہ قمیصیں جن کے کالر نہیں تھے۔ قمیصیں جن
کی پیٹھ اڑ گئی تھی۔ قمیصیں جو چار آنے گز والی تھیں۔ قمیصیں جو میل کچیل سے
دُلہن بنی ہوئی تھیں، قمیصیں جو اپنے بٹن کھا چکی تھیں۔ قمیصیں جو قمیصیں
کم اور دھجیاں زیادہ تھیں۔ قمیصیں جو قمیصیں نہیں تھیں۔ صرف فرض کئے
ہوئے فارمولے تھے۔

شری دھاگے دن بھر کنولیتاگ کرتے، سیٹھ جی کے کنبے کو آشیرواد
دیتے ہر روز صبح اُٹھ کر ڈرم کا ڈھکنا کھولتے اور گانے لگتے ؎

بھج من رام نام سُکھدائی

اور اس طرح قمیص دان یگیہ کو جب پورے اکیاون (۵۱) دن گذر گئے۔ تو
شری دھاگے نے ستاروں کی چال دیکھ کر یہ اعلان کیا کہ اب یگیہ سمپورن
ہوگیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سبھی کرایہ داروں کو کُنڈ کے اِرد گرد بلایا
اور کہا۔

"دوستو! یہ ایشور کی کرپا ہے اور سیٹھ جی کی دیا ہے اور آپ
لوگوں کا بھاگیہ ہے کہ قمیص دان یگیہ نہایت شانتی پورک ختم ہوگیا۔
اب میں یہ قمیصیں اس کُنڈ میں سے نکالوں گا۔ اور آپ لوگوں کو پہناؤں گا"
—— چنانچہ شری دھاگے نے تمام قمیصیں نکال کر ایک چادر

پھر بچھا دیں اور گننی شروع کیں۔

"یہ قمیصیں تو بہت چھوٹی ہیں!" گُم داس چلّایا۔

"ہاں یہ آئے ہیں نمک کے بھاؤ ہیں۔" دوسرا کرایہ دار غرّایا۔ "ہم کرایہ داروں کی تعداد پینتالیس ہے اور قمیصیں صرف گیارہ ہیں۔"

شری دھاگے نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "دان کی تو یہ ناک بھوں نہیں چڑھایا کرتے بیٹا۔ مل جل کر گزارہ کرو اور باری باری سے پہن لیا کرو۔"

"لیکن ....؟" گُم داس اور بھی غصّے میں چلّایا۔ "ہم مل جُل کر تو انہیں پہن ہی لیں گے۔ مگر یہ سبھی قمیصیں نہایت خستہ حالت میں اور پھٹی ہوئی ہیں اور میلی چیکٹ ہیں اور پہننے کے قابل ہی نہیں ہیں۔"

شری دھاگے نے کہا۔ "ارے بھائی! انہیں صابن سے دھو لینا۔ ان کی سلائی کر لینا۔ مرمت کر لینا اور پھر پہن لینا۔ بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟"

"آپ کا ارشاد سر ماتھے پر۔ مگر یہ صابن اور دھاگا اور سوئیاں کہاں سے آئیں گی۔ یہ بھی آپ نے سوچا؟"

"—— اب یہ سوچنا تمہارا اپنا کام ہے۔"

"ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہم صابن وغیرہ خریدنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ ہم تو دو وقت کی روٹی کھانے کے قابل نہیں ہیں شری دھاگے جی!"

"تو پھر؟ .... تو پھر ....؟" شری دھاں پان نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگے کہ صابن اور سوئی دھاگہ کہاں سے آئے گا۔ یہ کرایہ دار تو قدم

قدم پر مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ بیلی چکٹ قیمتیں ان کے سامنے پڑی تھیں۔ دان دھرم کی توہین ہو رہی تھی۔ اور صابن اور دھاگہ دُور دُور تک کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک جیسے شری دھان پان کو الہام سا ہُوا ——— اُنہوں نے سر اُٹھایا۔ گردن اٹھائی، آنکھیں اُٹھائیں اور بولے۔ "اچھا یہ بتاؤ یہ چیزیں کہاں سے مِل سکیں گی؟"

"سیٹھ گنپت رائے اینڈ سنز۔ جنرل مرچنٹس بازار لیٹریاں کے ہاں سے"

"تو بس! مسئلہ حل ہو گیا۔ آپ لوگ مجھے یہ قیمتیں خدا کی خدا اُتار دیجئے۔"

چنانچہ کرایہ داروں نے حکم مانتے ہوئے قیمتیں اُتار دیں۔

شری دھاگے نے ان کی ایک گٹھڑی بنائی اور پھر باہر نکل کر سیدھے پُرانے کپڑوں کی مارکیٹ میں پہنچے۔ پُرانے کپڑوں کے ڈیلر سیٹھ گنپت رائے کے بھتیجے چمپت رائے کے ہاتھ اُنہوں نے یہ قیمتیں دو روپے تین آنے نقد رقم کے عوض بیچ دیں۔ روپے ہاتھ میں لے کر وہ سیٹھ گنپت رائے، دھنپت رائے اینڈ سنز جنرل مرچنٹس کی دوکان پر آئے۔ وہاں سے دو روپے تین آنے میں صابن کی گیارہ ٹکیاں، گیارہ سوئیاں اور دھاگے کی گیارہ گولیاں خریدیں۔ اور شام تک گھر لوٹ آئے۔ اور ہنسی خوشی کرایہ داروں کو ایک ایک صابن کی ٹکیہ سوئی اور دھاگے کی گولی دان کر دی۔

اور دوسرے دن سیٹھ گنپت رائے نے شری دھاگے کو کمرے کا کرایہ ادا نہ کرنے کے الزام میں بلڈنگ سے نکال دیا۔ اور یُوں قیمت دان تحریک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر شانتی پورک ختم ہو گئی۔

بید کی کرسی

آج مجھے اپنی اس بید کی کرسی کی یونہی سی یاد آرہی ہے۔ جسے میں نے ایک سال پہلے خریدا تھا ــــــ

بات یوں ہوئی کہ اس دن میں چاندنی چوک میں سے گذر رہا تھا جب یہ بید کی کرسی مجھے نظر آگئی اور میں نے سوچا کہ اسے خرید لیا جائے۔ ہندوستان کے ایک عظیم ادیب کی حیثیت میں یہ بات بے حد شرمناک تھی کہ میرے گھر میں ایک کرسی بھی نہ ہو۔

دریائی ملاحوں کا ایک چیچک زدہ سیاہ فام لڑکا اس کرسی کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ اِس لئے مَیں نے اندازہ لگایا کہ شائد (نہیں یقیناً) یہی لڑکا اس کرسی کا مالک ہوگا۔ وہ اسے سڑک پر رکھے کسی

گاہک کے انتظار میں تھا۔ ایک طرف میں اس کی جانب بڑھا۔ دوسری طرف سے پاؤں لہراتا ہوا ایک منچلا سپاہی بڑھا اور مجھ سے پہلے اس کرسی تک جا پہنچا۔ اور پھر اپنے بھاری کم بوٹ کی نوک سے کرسی کو لڑھکا دیا اور طرح لڑکے پر گرجا۔

"کیوں بے کیوں رکھی ہے یہ کرسی یہاں پر۔ کیا یہ تمہارے باپ کی سڑک ہے؟"

لڑکا کپکپا اٹھا اور اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے ہونٹ لرزائے جیسے کہنا چاہتا ہو۔ "حضور میں نہیں جانتا یہ کس کے باپ کی ہے۔ مگر کم از کم میرے باپ کی نہیں ہے۔"

"اٹھاؤ یہ کرسی یہاں سے اور بھاگ جاؤ۔" سپاہی نے آرڈر جاری رکھا

میں پریشان ہو گیا۔ اگر یہ لڑکا واقعی کرسی اٹھا کر کہیں بھاگ گیا۔ تو کرسی بھی بھاگ جائے گی۔ اور میں کرسی نہیں خرید سکوں گا۔ چنانچہ میں ابھی سانس روک کر اپنے حسب مراد نتیجے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ لڑکے کو ہاتھ جوڑتے ہوئے دیکھ کر تین چار معزز راہ گیر بھی آ گئے۔ اور میں قریب قریب مایوس ہو گیا۔ کہ اس ہنگامے میں لڑکے سے کرسی کا مول کرنا سراسر بے وقوفی ہے ——— نہ جانے یہ راہگیر لوگ چلتے چلتے کھڑے ہو جانے کے بہانے کیوں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اب اگر میں کرسی خریدنے کی بات چھیڑ بھی دوں تو ہو سکتا ہے سپاہی مجھے بھی کسی نہ کسی جرم میں گرفتار کر لے۔ ان سپاہیوں کا کیا اعتبار ہے؟

چنانچہ میں نے کرسی خریدنے کا خیال ترک کر دیا اور سوچا کہ گرفتار ہونا کافی ناگوار فعل ہے۔ کیونکہ مجھے آج رات کی گاڑی سے ہی جالندھر پہنچنا ہے۔

یہ سوچ کر میں آگے بڑھ گیا۔ اس وقت تک مجمع بھر سنے والے معززین اپنے اپنے دل کا غبار نکال چکے تھے۔ اور آخر میں ایک معزز صاحب تقریر کر رہے تھے ——— "دوستو! میں کہتا ہوں۔ آخر قانون بنایا کس لئے جاتا ہے۔ قانون بنانے والے اندھے نہیں ہوتے کہ ...."

کانسٹیبل نے ایک ہاتھ سے لڑکے کی کلائی مروڑ رکھی تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے اس معزز مقرر کو داد دے رہا تھا۔ اس کا تیسرا ہاتھ نہیں تھا۔ اس لئے کرسی پہ اس نے اپنا پاؤں رکھا ہوا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب میں دو چار کام بھگتا کر دوبارہ ادھر سے گزرا تو سیاہ فام ملّاح لڑکا پھر وہیں اپنی کرسی رکھے فتح مندانہ انداز میں نعرے لگا رہا تھا۔

"تین روپے۔ تین روپے۔ تین روپے۔"

مجھے اس سپاہی پر بڑا غصّہ آیا۔ جو اس چھوٹے سے لڑکے کو نہیں بھگا سکا۔ ایسا بزدل سپاہی بھلا ہمارے دیش کا کیا بھلا کر سکے گا ... ." لیکن دیش کی بھلائی چونکہ ایک گہرا اور پیچیدہ موضوع تھا۔ اس لئے اسے ذہن سے جھٹک کر میں نے یہ سوچنا زیادہ مناسب سمجھا کہ اب میدان صاف ہے اور کرسی خریدنے کی گفتگو آسانی سے شروع کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ مَیں جلدی سے لپک کر اس لڑکے کے قریب چلا گیا۔ اور کہا ——
" یہ کُرسی مَیں خریدنا چاہتا ہوں " —— (" مجھے " " مَیں " پر زور دینا چاہئے تھا)
" تین روپے بابوجی! "
" نہیں! اڑھائی روپے۔ "
لڑکے نے بڑی نامعقولیت برتتے ہوئے کورا سا جواب دیا کہ " مَیں تین روپے سے کم میں نہیں بیچوں گا ——
مَیں چلّایا —— " لیکن یہ کُرسی اڑھائی روپے سے زیادہ کی بالکل نہیں —— چند دن پہلے میرا ایک دوست یہیں سے اڑھائی روپے میں بالکل ایسی ہی کُرسی لے گیا تھا۔ یہ آٹھ آنے کا ظلم تم مجھ پر کیونکر توڑ سکتے ہو یہ تو اندھیر گردی ہے "
لڑکا بڑبڑایا۔ " بابوجی! لینا ہے تو لے لو۔ تین روپے سے کم میں یہ کُرسی ہرگز فروخت نہیں کروں گا۔ ابھی ابھی اس سالے لال پگڑی والے کو آٹھ آنے بھاڑا دیا ہے۔ "
" لیکن یہ کہاں کا قانون ہے کہ تم سپاہی کا بھاڑا بھی کُرسی کی لاگت میں شمار کر لو۔ " مَیں نے ایک اہم ٹیکنیکل نکتہ اُٹھایا۔
سیاہ فام لڑکا شائد اَن پڑھ تھا۔ کیونکہ یہ ٹیکنیکل نکتہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ اور وہ اپنے نرخ پر اڑا رہا۔ مَیں سوچنے لگا کہ گویا آٹھ آنے جو سپاہی مذکور اس سیاہ فام لڑکے سے لے گیا۔ وہ دراصل اس سیاہ فام لڑکے کے نہیں تھے بلکہ میرے تھے۔

لیکن یہ خواہ مخواہ کی بے ہودہ قانونی موشگافی تھی ۔ سپاہی چلا گیا تھا ۔ وقت گزر گیا تھا۔ اور جب وقت گزر جائے ۔ تو قانون ہمارا انسان کی کیا مدد کر سکتا ہے ۔ اِس لئے مَیں نے تھوڑی دیر سوچ کر تین روپے لڑکے کی ہتھیلی پر رکھ دیئے ــــــــ

اب یہ کرسی میری تھی ۔

مَیں ابھی کرسی اُٹھانے کے لئے کسی رکشا والے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک جنٹلمین جس کا طرّہ بھی پولیس کی طرح اکڑا ہُوا تھا۔ ہمارے قریب آتا ہُوا دکھائی دیا ۔ اسے دیکھتے ہی سیاہ فام لڑکا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ گیا ۔ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کیوں بھاگ گیا۔ انسان آخر بھاگتے دوڑتے ہی رہتے ہیں ۔ اِس لئے ...... مگر اتنے میں طرّہ باز جنٹلمین نے چھڑی کی نوک میری اپنی کرسی کے کلیجے میں بڑی افسوسناک حد تک بھونکتے ہوئے کہا۔

" اے مسٹر! آپ نے اِس کرسی کو کیوں پکڑ رکھا ہے ؟ "

" یہ میری ہے ، مَیں نے ابھی ابھی تین روپے میں خریدی ہے ۔ "

" دیکھئے ـــــ! " وہ طرّہ جھٹکا کر بولا۔ " میرے سامنے جھوٹ بولنے کی جراُت مت کیجئے ۔ کیونکہ مَیں میونسپلٹی کا تہ بازاری انسپکٹر ہوں ۔ اور یہ لڑکا جو ابھی بھاگ گیا ہے ۔ اس کے پاس بازار میں کھڑے ہو کر کرسی بیچنے کا لائسنس نہیں تھا "

" اب تو وہ بھاگ گیا ...... " مَیں نے قہقہہ لگا کر اس طرّہ باز انسپکٹر کی ہیکڑی پر چوٹ لگانے کی کوشش کی ۔ " لہٰذا اب آپ کیا کر سکتے ہیں ؟ "

"کہاں جا سکتا ہے سالا۔ اس کی کرسی تو یہاں موجود ہے۔ خود بخود جھک مار کر واپس آ جائے گا۔" انسپکٹر نے اب کرسی پر اپنی چھڑی کا دباؤ اور سخت کر دیا۔

لیکن جناب! جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ کرسی اب میری ہے۔ میں نے واقعی اس لڑکے کو تین روپے دے کر خریدی ہے۔"

انسپکٹر نے میرے اس جھوٹ پر ناک سکوڑا۔ "مجھے بنانے کی کوشش مت کیجئے اور بتائیے کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کرسی آپ نے خریدی ہے۔ جبکہ اس لڑکے کے پاس میونسپلٹی کا لائسنس تک نہیں تھا۔"

میرا جی چاہا کہ انسپکٹر کے منہ پر طمانچہ مار کر کہوں کہ میرے پاس سوائے اس کے کوئی ثبوت نہیں ہے ——— لیکن ایک مہذب شہری کے طور پر میں نے یہ تمیزی کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ اور کہا۔

"دیکھئے انسپکٹر صاحب! یہ اس لڑکے کی صریحاً بد دیانتی ہے۔ اسے لائسنس ضرور لینا چاہئے تھا۔ دراصل انسپکٹر صاحب بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے ستانوے فیصدی عوام ان پڑھ ہیں۔ یہ لڑکا بھی شاید انہیں میں سے ایک ہوگا۔ اس لئے ....."

"——— سالا کتے کا تخم ہے۔ ہر روز ایسا کرتا ہے۔ آج میں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "ہر روز ایسا کرتا ہے تو انسپکٹر صاحب

آپ نے اسے کل کیوں نہیں پکڑا تھا۔"

میری یہ بات سُن کر اِنسپکٹر جھینپ گیا۔ لیکن شائد وہ یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ کل اسے اُس نے کیوں نہیں پکڑا۔ خیر۔ اس معاملے میں مَیں اِنسپکٹر کو مجبُور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لئے مَیں نے یہ سمجھ کر کہ اب اِنسپکٹر میری دیانتداری کا قائل ہو گیا ہوگا۔ رکشا والے کو آواز دی اور اس پر اپنی کرُسی اُٹھا کر رکھنے لگا۔

اِنسپکٹر غرّایا۔ "اے مسٹر! آپ نے سُنا نہیں ـــــ یہ کرُسی آپ نہیں لے جا سکتے۔"

مَیں نے بھی غُرّانا چاہا کہ "کیا آپ نے سُنا نہیں کہ مَیں یہ کرسی تین روپے میں خرید چکا ہوں۔" لیکن پھر مَیں نے اِنتہائی صبر کے ساتھ سوچا کہ یہ شخص مجھ سے ثبوت مانگیگا۔ اَور ثبوت کے سلسلہ میں میرا ذہن کافی پھسڈی ثابت ہو چکا ہے۔

"دیکھئے مسٹر اِنسپکٹر! مَیں ایک شریف آدمی ہوں۔ اور وہ لڑکا بہت بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ مجھ پر اِعتبار کیجئے کہ مَیں نے ہی یہ کرُسی خریدی ہے۔"

اِنسپکٹر نے میرے اِعتبار پر بے اعتباری کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ہیر پھیر کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر چلے جائیے۔ ورنہ اگر آپ نے زیادہ مین میکھ کی۔ تو مَیں آپ پر یہ الزام لگانے کیلئے مجبُور ہو جاؤں گا۔ کہ آپ نے اس لڑکے کو جان بُوجھ کر بھگا دیا۔ اور

اس طرح قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔"

اب معاملے کی نزاکت کو سمجھنا مشکل نہیں رہا۔ چنانچہ دو منٹ ہی کے بعد میرے براق اور چالاک ذہن نے مجھے مشورہ دیا کہ اسے کچھ دے دلا کر اپنا الّو سیدھا کرو۔ کیوں خواہ مخواہ جھنجھٹ میں پڑتے ہو۔

انسپکٹر آٹھ آنہ پر راضی نہیں ہوا۔ اس سے تو وہ سپاہی غنیمت تھا جس نے آٹھ آنے لے کر لڑکے کو کھڑا رہنے کا "لائسنس" دے دیا تھا۔ بہرکیف دس آنے دے کر تین روپے کی کرسی حاصل کر لینا کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے چپکے سے دس آنے اس کی مٹھی میں تھمائے اور وہ دس آنے لے کر اپنی ڈیوٹی نبھانے کے لئے آگے چلا گیا۔ اور میں نے رکشا پر آزادی سے کرسی رکھ کر رکشا قلی سے کہا "قرول باغ چلو۔"

قرول باغ میں مجھے ایک دوست کے ہاں الوداعی دعوت کھانا تھی اور اس کے بعد رات کی گاڑی سے جالندھر جانا تھا۔ رکشا والے نے پوچھا۔ "بابوجی! کتنے میں لی ہے یہ کرسی؟"

میں نے دل ہی دل میں حساب لگا کر بتایا۔ "چار روپے دو آنے میں"

"بہت مہنگی خریدی ہے بابوجی! ایسی کرسیاں تو دو دو روپے میں عام مل جاتی ہیں۔"

"جی ہاں! دراصل میں چیزیں خریدنے کے معاملے میں ذرا جلد باز واقع ہوا ہوں۔ بہرکیف اتنی مہنگی نہیں ہے۔ جتنی تم سمجھ رہے ہو

تم قرول باغ کا کتنا کرایہ چارج کروگے؟"

"چھ آنے"

"خوب!" ـــــ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ رکشا والا بے حد کمینہ آدمی تھا۔ کیونکہ وہ مجھے ٹھنڈی سانس بھرتے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس مسکراہٹ پر مجھے ایک زہریلا سا فارسی کا شعر یاد آیا ـ نہ جانے کونسا شعر تھا جو پوری طرح یاد نہ آیا۔ اس لئے اور بھی کوفت ہوئی ـــــ

اپنے دوست کے ساتھ کھانے کی میز پر طبیعت بیحد شگفتہ رہی۔ میں نے اسے بڑے فخر سے بتایا کہ اب جب کبھی تم میرے گھر آؤ گے تو ہندوستان و پاکستان کے (اس مرتبہ میں نے پاکستان کو بھی شامل کر لیا) بلند پایہ ادیب کے گھر میں ایک کرسی بھی پاؤ گے۔ میرے دوست نے بتایا کہ بید کی یہ کرسیاں ہمارے قدیم اور کلاسیکی فن کا اظہار کرتی ہیں۔ اور ہم ترقی پسندوں کو اپنی کلاسیکی روایات کی سرپرستی کرنی چاہئے۔ ویسے بھی آج کل اگر کسی کے گھر میں کرسی نہ ہو تو آدمی یونہی سا لگتا ہے۔ (شاید گنوار سے مطلب تھا میرے دوست کا) وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ۔ ـــــ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے ذہن پر اس کرسی کی افادیت اور اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ اور جب میں وہاں سے فارغ ہو کر کرسی اٹھائے ہوئے خوش و خرم ایک بس سٹینڈ پر آیا تو مجھے اس کرسی پر تخت طاؤس کا شبہ ہونے لگا۔ (یہ تخت شاید کبھی بادشاہ کے پاس تھا)

اسٹیشن پر جانے والی لوکل بس آئی ۔ مَیں نے جلد جلد اپنے آپ کو اٹن شن کر لیا ۔ اور کرسی اٹھا کر بڑی تمکنت سے بس میں داخل ہونے لگا۔

"اے! اے! .... اے مسٹر! " بس کے دروازے پر اچانک بہت سی آوازوں نے میری کرسی کو روک لیا ۔ "کہاں لے آئے ہو یہ کرسی ۔ یہ بس ہے بس ۔ سمجھے! "

" جی ہاں یہ بس ہے اور یہ کرسی ہے اور یہ میں ہوں ۔" میں نے کرسی کو دھکیلتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ خواہ مخواہ مزاحیہ فقرے کسنے کی کوشش کی ۔ان مسافر لوگوں کو گرویدہ کرنے کے لئے یہ مزاحیہ سٹنٹ اکثر چل جاتا ہے ۔

سٹنٹ فیل ہو گیا ۔ کرسی کو اندر سے واپس دھکیلا گیا ۔ میں نے پھر اندر دھکیلا ۔ اُدھر سے واپس دھکیلا گیا ۔ میں نے پھر دھکیلا اندر شور بڑھ گیا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جھگڑے کے مادّی اسباب کیا ہیں ۔ لیکن ایک آدھ منٹ کے بعد اچانک ایک سبب میرے ہاتھ میں آ گیا ۔ یعنی کرسی تو اندر چلی گئی ۔ اور اُس کا ایک بازو یعنی مادّی سبب ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں رہ گیا ۔ اور ساتھ ہی میں بھی دھڑام سے پھسل کر نیچے فرشِ زمین پر آ رہا ۔ میں اور کرسی ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور کنڈکٹر نے وِسل دے دی ۔

اب غصّہ بے جا تھا ۔ اور بجلی کے سے تیز فیصلہ کی ضرورت تھی بس چل پڑی تھی ۔ چنانچہ میں نے لپک کر ایک ہاتھ سے بس کا ہینڈل

پکڑ لیا۔ یہ ناممکن تھا کہ میں گر کر چکنا چور تو ہو جاتا۔ مگر کرسی کو ہاتھ سے یوں جانے دیتا۔

بس میں داخل ہوتے ہی سبھی مسافروں کی نگاہیں مجھ پر یوں پڑیں جیسے وہ بھانت بھانت کے الزامات مجھ پر لگا رہی ہوں۔ مگر ان الزامات کی جب کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔ تو میں کیوں پریشان ہوتا۔ اس کے باوجود میں نے ایک دو منٹ تک خاموش رہ کر اپنے آپ کو متوازن کیا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ کنڈکٹر سے یہ پوچھتا کہ میری کرسی کا بازو توڑنے میں کس کس کا ہاتھ ہے۔ کنڈکٹر نے خود ہی قینچی کٹکٹائی اور کہا ——

"جناب بس میں ایسی چیزیں لانے کی قانونی ممانعت ہے۔"

قانونی ممانعت کے الفاظ میرے غصّہ کی آگ پر برف کی طرح گرے اور میں نے فوراً پینترا بدل کر کہا —— "معاف کیجئے غلطی ہو گئی اور غلطی یوں ہوئی کہ بسوں میں سامان رکھ کر میں کئی بار سفر کیا ہوں۔"

"اور معاف کیجئے۔ چند بسوں میں یہ اجازت ہوتی ہے اور چند میں نہیں۔"

یہ سن کر میں شیر ہو گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ بس کمپنی نے یہ دو قسم کی بسیں بنا کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان دو قسم کی بسوں کے متعلق اصولی جنگ کرنا (ایک "ٹٹ پونجیئے کنڈکٹر" کے ساتھ توہین انگیز تھا۔ اس لئے اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھا جا سکتا ہے۔

چنانچہ مَیں نے دِل ہی دِل میں کنڈکٹر کو معاف کر دیا۔ اور بظاہر بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔ "یہ لیجئے چار آنے اور مجھے اسٹیشن تک کا ٹکٹ کاٹ دیجئے۔"

"چار آنے اور نکالئے۔" کنڈکٹر نے ترکی بہ ترکی حملہ کیا۔

"کس سلسلے میں؟" مَیں نے مُنہ چڑانے کے انداز میں کہا۔

"اس کرسی کا پوری سواری کا کرایہ لگے گا۔"

"لیکن یہ تو بے جان ہے۔ اور پھر اسے کوئی سیٹ بھی نہیں دیجائیگی"

"مَیں کچھ نہیں جانتا۔ یہی قانون ہے۔"

مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ قانون بنانے والے آخر قانون بناتے وقت اتنا کیوں نہیں سوچتے۔ کہ قانون پر عمل کرنے والے کچھ نہیں جانتے۔

"لیکن سوچئے تو۔ یہ بید کی کرسی ہے اور کافی ہلکی پھلکی ہے۔"

"آئندہ سے بھاری پھر کم پتھر کی کرسی خریدا کیجئے۔"

تو گویا اب میرا مذاق بھی اڑایا جا رہا تھا۔ ایک بزرگ اور سفید ریش شریف سے بوڑھے نے مجھے مشورہ دیا کہ چار آنے دے دیجئے۔ شاید اس جھگڑے سے اس شریف بوڑھے کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔

مَیں نے صرف بوڑھے کے دردِ سر کی خاطر چار آنے نکال کر دے دیئے (ورنہ کیا کرتا؟) اور کرسی کا ٹکٹ بھی کٹوا لیا۔ کرسی کا ٹوٹا ہوا بازو میرے ہاتھ میں تھا۔ جسے مَیں نے انتہائی حقارت سے دیکھا۔ اور پھر اسے کرسی پر رکھ دیا۔ ہر چیز اپنی جنس ہی کے ساتھ موزوں رہتی ہے۔ اور پھر مجھ

غریب ادیب کے چار آنے کی بدولت اسے بس میں سفر کرنے کا سوبھاگیہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔

بس میں کھڑے کھڑے میں راستہ بھر خاموش رہا۔ نہ جانے میں اُداس تھا یا غصّے میں تھا۔ یا کسی چیز کا مزا لے رہا تھا۔ بہرکیف میں راستے میں کسی سے نہ بولا۔ بھلا یہ بولنے کا ماحول تھا۔ لُوٹ مار اور اندھیر گردی سے بھری ہوئی اس بس میں سوائے خاموشی کے اِنسان کو اور کیا مل سکتا تھا۔

اسٹیشن کے نزدیک میں بس سے اُتر گیا۔ کرسی بھی اُتر آئی۔ یہ تو اب میرے جی کے ساتھ تھی۔ اور لمحہ بہ لمحہ مارکیٹ میں اس کی قیمت بڑھ رہی تھی۔ ابھی ابھی ایک منٹ پہلے اس کی پیداواری لاگت میں چار آنے کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اسے بظاہر خوش خلقی اور بباطن سنگدلی سے اُٹھائے ہوئے اسٹیشن کے احاطہ تک لے آیا۔ اور پھر اپنے اٹیچی کیس میں نیلے رنگ کا ایک نیا ازار بند نکال کر اس کے ٹوٹے ہوئے بازو کو جوڑ دیا اور اب وہ اس قابل تھی کہ دیکھنے والا بطور کرسی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

اور پھر اسے اُٹھا کر میں نے کندھے پر سوار کر لیا اور چلنے لگا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے قریب بے حد بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک آدمی کا کھوا میری کرسی کے کھوے سے چھل گیا۔ فوری خدشہ یہ ہُوا۔ کہ کہیں اس آدمی کی بجائے میری کرسی کا ہی کھوا یعنی ٹوٹا ہُوا بازو نہ چھل گیا ہو۔ اِتنے میں اُس آدمی نے جل بھُن کر کہا۔

" اندھے ہو۔ دیکھ کر نہیں چلتے ! "

بَیں یقیناً دیکھ کر چل رہا تھا۔ لیکن میں اپنی کرسی کی ذمہ داری کیسے لے سکتا تھا
افسوس! اس آدمی کو اتنا بھی علم نہیں تھا کہ کرسی کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ آنکھیں
تو ایک طرف۔ اس بے چاری کی ٹانگ تک ٹوٹی ہوئی تھی۔ لیکن راہ چلتے ہر آدمی
کو آنکھ اور ٹانگ کے مسائل سمجھانا کونسا آسان ہوتا ہے۔

اس لئے میں نے کرسی کی طرف سے اُس آدمی سے معذرت کرنا چاہی۔ مگر
وہ آدمی نہ جانے کہاں جا چکا تھا۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ پروٹسٹ کرتے ہیں۔ مگر نتیجے
سے بے نیاز ہو کر کہیں بھاگ جاتے ہیں —— بزدل لوگ!"

مَیں نے ٹکٹ خریدا اور اس ڈر سے کہ کہیں اس مرتبہ میری کرسی کا کھوا کسی
اور اندھے سے نہ چھل جائے۔ مَیں نے ایک قُلی کو بلا کر اسے کہا کہ اس شریف زادی
کو با آرام پلیٹ فارم نمبر ۲ پر لے چلو۔

قلی نے بیک وقت میری اور ٹوٹی ہوئی کرسی کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے مَیں
اور کرسی ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ مجھے قلی کی یہ ادا بہت ناپسند آئی۔ کیونکہ
کرسی اور مجھ میں کوئی زمین اور آسمان کا فرق نہیں تھا۔ میری پتلون کا ایک
پائنچہ اور کرسی کا ایک بازو دونوں ٹوٹے ہوئے تھے۔ لیکن کبھی ایک وقت
ایسا بھی آیا تھا۔ جبکہ یہ پتلون اور کرسی صحیح و سالم اور نئی نویلی تھیں۔ اس وقت
یہ اُلو ...... قلی کہاں مر گیا تھا۔ مَیں نے قلی کو جلدی جلدی بوکھلا دینے کی
کوشش کی۔ "فٹا فٹ لے چلو دوست! کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔"

میرے پاس اور کوئی سامان نہیں تھا۔ اس لئے شاید قلی کو یہ بات بڑی
بے ہنگم معلوم ہوئی کہ وہ صرف یہی ذلیل سی بید کی ٹوٹی ہوئی کرسی اٹھا کر چلے۔

حالانکہ وہ صرف قلی تھا۔ اسے دوسرے سماجی مسائل سے دلچسپی کا کوئی حق نہیں تھا۔ "سوائے تین آنہ فی پھیرا" ریلوے ریٹ کے۔

چار و ناچار اس نے کرسی اُٹھائی۔ اور مریضانہ رفتار سے گیٹ کی طرف بڑھا گیٹ کیپر نے ہاتھ کے اِشارے سے قلی کو روک لیا۔

"یہ کرسی کس کی ہے؟" اُس نے پولیس مینوں کی طرح کہا۔

"ان بابو صاحب کی۔" قلی نے مجرم کی طرف اِشارہ کیا۔

"بُک کرالی؟" گیٹ کیپر نے دھمکی دی۔

گیٹ کیپر کے ذہن میں کرسی کی بکنگ کا کیا مفہوم ہوگا؟ اس کے بارے میں ایک واہیات سا لچا دھندلکا میرے ذہن میں پھیل گیا۔ یعنی مفہوم دھندلکے میں گم تھا۔ اور میں گیٹ کیپر کا منہ تک رہا تھا۔ جیسے گیٹ کیپر ابھی ابھی میرے چہرے کے سفید کاغذ پہ مفہوم کے حروف لکھ دیگا۔

"لیکن یہ تو ....." شاید میں نے کہنا چاہا کہ یہ تو کرسی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے یہ میرا کوٹ ہے۔ یہ میرا بُوٹ ہے۔ یہ میری قمیص ہے۔ ——— مگر میں کہہ نہ سکا۔ سوچا کہ اگر ان دوسری چیزوں کا ذکر بھی کر بیٹھا تو ہو سکتا ہے۔ ان چیزوں کی بکنگ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جائے۔ اس لئے گیٹ کیپر کو ان چیزوں کے متعلق اندھیرے میں ہی رکھنا مناسب ہے۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں کہ اس کرسی کو بُک کرا لیا ہے یا نہیں۔"

"جی نہیں۔" آخر جواب تو دینا ہی تھا۔

"تو پھر آپ اسے اندر نہیں لے جا سکتے۔ پہلے اسے بُک کرا لیجئے۔" لہجہ شریفانہ مگر قاتلانہ تھا۔

"لیکن آپ ذرا ٹھنڈے دِل سے سوچئے" ـــــ مَیں نے چالاکی کرنی چاہی۔ "گاڑی چھوٹنے میں صرف چار پانچ مِنٹ باقی رہ گئے ہیں۔ اور مجھے آج جالندھر ضرُور پہنچنا ہے۔ اور میری خواہش یہ ہے کہ مَیں اس کرُسی کے ساتھ ہی جالندھر پہنچوں۔ آپ ہی مہربانی کر سکتے ہیں۔ اس لئے جانے دیجئے۔"

گیٹ کیپر کو نہ جانے دُنیا کی کس چیز پر رحم آیا۔ کہ اُس نے مجھے جانے دیا اور ساتھ ہی مستقبل کے خدشے سے بھی آگاہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "میری طرف سے تو لے جائیے۔ لیکن چیکنگ ہو گئی تو راستہ میں دُگنا چارج ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ فرنیچر ہے۔ اور فری اسباب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔"

مَیں نے شکریہ کے طور پر گیٹ کیپر کو کیپسٹن کا ایک سگرٹ نکال کر پیش کیا۔ اور کرسی کو اس کے پنجے سے چھڑا کر آگے لے گیا۔ قلی نے اسے اس کمال صفائی اور احتیاط سے گاڑی کے ڈبے میں داخل کیا۔ کہ مَیں نے قلی پر فریفتہ ہو کر اسے تین آنہ پھیرا کی بجائے چھ آنے پھیرا دیدیئے (قلی آٹھ آنے مانگ رہا تھا) اور اب گویا کیپسٹن کا ایک آنہ والا سگرٹ اور یہ چھ آنے شامل کر کے اس تختِ طاؤس پر چار روپے تیرا آنے خرچ ہو چکے تھے۔

گاڑی کے ڈبہ پر چاروں طرف میں نے ایک تصدیقی نظر دوڑائی۔ پورے ڈبے میں کوئی دوسری کرسی یا میز موجود نہیں تھی جن کے ساتھ میں اپنی کرسی رکھ کر اسے "صنفی ہم آہنگی" بخش سکتا۔ گیٹ کیپر کم بخت ٹھیک کہتا تھا۔ یہ کرسی سالی واقعی فرنیچر میں شامل ہے۔ اور اسی لئے محکمہ ریلوے نے اپنے ڈبوں میں اس کے لئے کوئی "صنفی جگہ" مخصوص نہیں کی۔ جرم کا احساس میرے اندر شدید ہو گیا۔ اسے دبانے کی کوشش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ احساسِ جرم مزید شدّت سے ابھرتا رہتا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اسے دبایا۔ خوف اور غصّے کے ملے جلے جذبے کے ساتھ کرسی کو اوپر برتھ پر رکھے ہوئے ایک قیمتی سے بستر کے اُوپر لٹا دیا۔ بستر کا مالک چلّایا ——

"دیکھئے دیکھئے اِس بستر میں نازک چیزیں ہیں۔"

مَیں نے اسے بتانا چاہا کہ میری کرسی بھی بید کی ہے اور نہائت نازک اور ہلکی پھلکی ہے۔ میں اسے یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ مَیں نے بھی آپ ہی کی طرح گاڑی کا ٹکٹ خریدا ہے۔ اور یوں مَیں اس سے لڑ جھگڑ کر قانونی بنیادوں پر کرسی کے لئے جگہ بھی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن کیا فائدہ تھا۔ اس کرسی سے اب مجھے کچھ زیادہ ہی ڈر لگ رہا تھا اس لئے میں کسی بھی شخص سے کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس میں کرسی کا ذکر آ جائے۔

برتھ سے اٹھا کر مَیں نے کرسی کو ایک کونے والی چھوٹی سی سیٹ کے سامنے ٹھیرا لیا۔ اس سیٹ پر کوئی آدمی سویا ہوا تھا۔ سوئے ہوئے شخص کو دھوکا دینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ کرسی بلا خوف و خطر

بیٹھ گئی۔ اور مَیں اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ میرے لئے سیٹ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مَیں نے ایمانداری سے یہ سوچا کہ ہم دونوں کے پاس صرف ایک ٹکٹ ہے۔ اور ہم میں سے صرف ایک کو سیٹ حاصل کرنے کا حق ہے۔ سو کرسی کو سیٹ مل ہی چکی ہے۔

ایک ادھیڑ عمر کے بیوپاری قسم کے آدمی نے پوچھا۔

"کتنے میں خریدی ہے جی یہ کرسی؟"

"جی پتہ نہیں۔ ابھی تک تو اسے خرید ہی رہا ہوں!"

بیوپاری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کے باوجود وہ مسکرا دیا۔ لوگ بچارے مسکرانے سے پہلے اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ کس بات پر مسکرا رہے ہیں۔ مَیں نے اس پر رحم کھاتے ہوئے کہا کہ اسے مَیں نے چار روپے تیرہ آنے میں خریدا ہے اور جواباً بیوپاری کو بھی مجھ پر رحم آ گیا۔ اور اس نے کہا کہ آپ اُلّو ہیں۔ مَیں نے اُسے سمجھایا کہ مَیں ہندوستان کا ایک شریف شہری ہوں۔ بیوپاری نے کہا کہ تب تو آپ اور بھی اُلّو ہیں۔ مَیں نے کہا۔ اس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ اُس نے کہا مارکیٹ کا نرخ خراب ہوتا ہے۔

بیوپاری سے زیادہ بحث کرنا فضول تھا۔

راستہ بھر میں تصوّر ہی تصوّر میں اس کرسی سے محبّت بھی کرتا رہا اور نفرت بھی۔ نیند آئی تو اونگھنے لگا۔ اونگھنے لگا تو دھڑام سے گر پڑنے کے خدشے سے کرسی کے قریب ہی فرش پر جم کر بیٹھ گیا۔ ایک بجے رات کو ایک مہربان اور نیک دل انسان اپنی منزلِ مقصود پر اُتر گیا۔ تو مَیں اس کی سیٹ پر

لیک کر بیٹھ گیا۔ تین بجے کے قریب شدید نیند آنے لگی۔ تو ایک ٹکٹ چیکر نے مجھے بستر استراحت سے جگا دیا۔ مَیں نے بڑی شرافت سے اُسے ٹکٹ دکھا دیا۔ اور مَیں آج تک حیرت کے سمندر میں غرق ہوں کہ اُس نے کرسی کو چیک کیوں نہیں کیا۔ بار بار یہی خیال آ رہا ہے کہ وہ ٹکٹ چیکر انسانی زندگی کے روز افزوں مصائب سے پوری طرح آگاہ تھا۔ یا ہو سکتا ہے یہ ایک حادثہ ہی ہو۔ سُنا ہے بعض حادثے بڑے بڑے تاریخی رول ادا کر جاتے ہیں۔ ورنہ اس کرسی کی کیا بساط تھی۔ سچ ہے، قدرت کے اٹل قوانین کے آگے کسی کی کیا بساط ہے؟

قصّہ کوتاہ ——— کیونکہ اب کرسی صحیح و سالم جالندھر اسٹیشن پر اُتر رہی تھی۔ اور میرا روواں روواں فرطِ کامیابی سے جھوم رہا تھا۔ گھر والے اس کرسی کو دیکھ کر خُدا کا شکریہ بجا لائیں گے۔ کہ جو اپنی برکت سے ہر گھرانے کو کرسی بخشتا ہے۔ مَیں نے بڑے فخر و انبساط سے ایک قُلی کو بُلا کر کرسی اس کے سر پر رکھوائی۔

کرسی جالندھر ریلوے اسٹیشن کے گیٹ سے نکل گئی۔ مگر مَیں گرفتار ہو گیا۔ اے میری کرسی کو بنانے والے سیاہ فام ملاح لڑکے! کیا تُو نے کرسی بنانے کے نتائج پر بھی غور کیا تھا۔ کیا تُو نے یہ بھی سوچا تھا کہ تیری تخلیق کتنی ادھوری ہے۔

یہاں معمولی سی وضاحت کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ کرسی ایک بار پھر فرنیچر ثابت ہوئی اور قلی کے مشورے کے مطابق مَیں نے

جالندھر کے اس ریلوے گیٹ کیپر کی خدمت میں ایک روپیہ بطور نذرانۂ پیش کیا۔ قلی اور گیٹ کیپر دونوں کی اس دلیل میں بڑا وزن تھا کہ دھلی سے جالندھر کا فاصلہ اڑھائی سو میل ہے۔ اور اگر واقعی حساب لگایا جاتا۔ تو اس کرسی پر کم از کم چار پانچ روپے کرایہ لگ جاتا۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہُوا کہ نہائت رعایتی کرایہ یعنی ایک روپیہ پر یہ کرسی جالندھر اسٹیشن پر آزاد کردی جائے اور قلی نے جو چار آنے مستزاد حاصل کئے۔ وہ اس کی حقیقی مزدوری سمجھ لی جائے۔

اب اسٹیشن سے میرے گھر کا فاصلہ صرف تین فرلانگ تھا۔ میں نے اسٹیشن پر منہ ہاتھ دھویا۔ بال سنوارے اور بڑے کروفر سے ایک رکشا پر کرسی کو رکھ کر لے چلا۔

"ٹھہریئے!" ایک دھان پان سا آدمی، عینک لگائے ہوئے، ایک فرسودہ سا میلا کوٹ پہنے رکشا کے پیچھے دوڑا ہُوا آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام کی جھلک تھی۔

"میں نے یہ رکشا سالم کرایہ پر لی ہے۔" میں نے اس کو اصلی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"یہ کرسی....؟" اس نے پھر کرسی کا نام لے کر میرے دل پر ضرب لگائی۔ یہ دنیا بھر کے لوگ آخر میری کرسی کا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ دل میں فوراً فیصلہ کیا کہ کم از کم اس شخص سے تو میں دو دو ہاتھ بھی کرلوں گا۔ اُچکا کہیں کا!

"اس کرسی پر چونگی لگے گی۔" اُس نے مجھے چیلنج کیا۔

"تم کون ہوتے ہو چونگی لگانے والے؟"

"میونسپل کمیٹی جالندھر کی چونگی نمبر تین کا محرر منشی سادھو رام ——"

"لیکن یہ کرسی تو میں اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔"

"جبھی تو چونگی لگے گی۔ اُتر آیئے نیچے!۔"

کیا احمقانہ حکم تھا۔ جس پر عمل کرنا پڑا۔ میں نیچے اُتر آیا۔

"دیکھئے۔ یہ بالکل نئی کرسی ہے۔ میونسپل بائی لاز کی دفعہ ۳۵ کے مطابق اس کرسی کے ساڑھے تین آنے دے دیجئے۔" وہ اپنے رجسٹر پہ جھک گیا۔ اور پنسل ہاتھ میں پکڑ لی۔ "نام لکھوا یئے۔"

"نہیں لکھواتا"، میرے لئے اب برداشت کی حد نکل چکی تھی۔ "میں یہ کرسی بیچنے کے لئے نہیں لے جا رہا۔ گھر کے استعمال کے لئے جا رہا ہوں۔ گھر کے استعمال کی چیزوں پر ٹیکس بالکل نہیں لگ سکتا۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

اس نے میونسپل بائی لاز کی کتاب کھول لی۔ "یہ دیکھئے۔ تین ماہ پہلے ٹیکس نہیں لگتا تھا۔ لیکن اب نئے قانون پاس کئے گئے ہیں۔ اس لئے آپ کو دینا پڑے گا۔"

"نئے قانون! نئے قانون!" میں غصے سے بوکھلا کر بڑبڑانے لگا۔ "جس کا جی چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے قانون گھڑ لیتا ہے۔ میں اب اس کرسی پر ایک دھیلا تک نہیں خرچنا چاہتا۔ میں اس کرسی کا کیس ڈٹ

کر لوں گا۔ میں میونسپل کمیٹی پر دعوے دائر کروں گا۔ میں اس کیس کو میں الاقوامی عدالت تک لے جاؤں گا۔ لیکن اس کرسی پر مزید ٹیکس نہیں لگنے دوں گا۔ سمجھ گئے آپ!"

منشی سادھو رام میری پوری بات سمجھ گیا۔ اور کہنے لگا۔

"تو پھر آپ اس کرسی کو یہاں چھوڑ جائیے۔ اور میونسپلٹی پر جا کر دعویٰ کر دیجئے۔ جب آپ جیت جائیں گے۔ تو یہ کرسی آپ کو میونسپلٹی کے مال خانہ سے واپس مل جائے گی۔"

"ہاں ہاں۔ رکھ لیجئے یہ کرسی۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں اس کرسی کی ــــ انصاف بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہاں ۔۔۔۔۔"

چنانچہ کرسی وہیں چھوڑ کر میں گھر آگیا۔ اور پھر آج تک اس کرسی کی سُدھ نہیں لی۔ آخر ایک معمولی سی کرسی ہی تو تھی۔ کوئی تخت طاؤس تھوڑے تھی۔

.... اِک گھر بنانا چاہیئے

ایک دفعہ کا ذکر ہے ——— اگرچہ یہ ذکر کسی پری دش کا نہیں میری بیوی کا ہے اور بیان بھی غالب کا نہیں۔ میرا ہے۔ کہ میری بیوی کو اچانک رونا آگیا۔ مَیں نے پوچھا۔

"بھاگوان روتی کیوں ہے۔"

وہ جواب نہ دے سکی اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ مَیں نے کہا۔

"مت رو میری جان! رونا بُری بات ہے۔"

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ مَیں نے کہا ——— "آج تمہارے لئے ایک لال دوپٹہ ململ کا لے آؤں گا۔"

لیکن وہ آنسو بہانے اور مُنہ کے راستے کڑوے گُونٹ نگلنے لگی۔ اس کے

بعد میں نے مزید خوشامد بند کردی اور اس سے پہلے کہ گھر سے باہر بھاگ جاتا۔ اُس نے میرا دامن، یعنی سگرٹ کی ڈبیہ پکڑلی اور کہنے لگی ۔"میری بات سُنتے جاؤ ورنہ یہ سگرٹ کی ڈبیہ نہیں دُوں گی۔"

سگرٹ کی دھمکی نشانے پر بیٹھی اور مَیں نے پیار، ورالتجا کے دورا ہے پر کسما کسا کہا ــــ "مجھے یہ رونا دھونا قطعی پسند نہیں۔ سمجھ گئیں تم؟"

"سمجھ گئی۔"

"تو پھر کیوں روتی ہو؟"

"گھر کی حالتِ زار پر۔"

مَیں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور کہا ــــ "یہ کام پنڈت نہرو کا ہے ہمارا تمہارا نہیں۔ ہمارا کام تو یہی ہے کہ گیتا والے کرشن بھگوان کے قول کے مطابق جی لگا کر کام کئے جائیں اور نتیجہ ــــ بھگوان پر چھوڑ دیں ۔"

"میرے ساتھ یہ چار سو بیس مت کرو۔ مَیں بھگوان کرشن کے آگے اپنا سر جھکاتی ہوں۔ وہ پرماتما کے اوتار تھے۔ لیکن پرماتما کا کوئی گھر نہیں ہوتا اور ہمارا ایک گھر ہے اور گھر کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ۔"

مَیں حیران تھا کہ آخر اِس گھر میں کیا نقص ہے۔ ایشور مہاراج کی کرپا سے چار، چار بچے ہیں۔ ایک بڑھیا ماں ہے۔ بیوی ہے۔ مَیں ہوں۔ چھ مربع گز کا ایک کمرہ ہے۔ ہر مہینے ساٹھ روپے نقد ناچتے، کودتے گھر میں آجاتے ہیں اِس سے زیادہ ایک معقول اور مہذّب گھر کا اور کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ مَیں نے لاڈ کرنے کے انداز میں کہا ــــ "ایک اچھے گھر کا مفہوم واضح

کرو۔ میری پیاری بلّو!"

اُس نے آسمان پر نظریں جماتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اور بڑے رُومانٹک انداز میں بولی:۔ "ایک ایسا گھر جس میں حسن ہو۔ نزاکت ہو، خوشبو ہو۔ توازن ہو۔ چمک اور رنگ ہو اور جس میں بیٹھ کر یوں محسوس ہو جیسے ہم جھولا جھول رہے ہیں"

"تو تمہارا مطلب ہے ہم ہوائی جہاز خرید لیں؟"

بیوی نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا۔۔" تم کیا ہوائی جہاز خرید و گے۔ بچّے کے لئے دو پیسوں کا جھنجھنا تو خرید نہیں سکتے اور خواہ مخواہ زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہو۔ مَیں کہتی ہوں اگر تم کو اس گھر کے بہتر بنانے کا خیال ہو۔ تو پانچ ہی دنوں میں اِس گھر کی کایا پلٹ سکتی ہے۔"

یہ سُن کر مجھے محسوس ہوا جیسے اب بات سنجیدہ ہو گئی ہے۔ بیوی کے تیوروں پر کسی پلاننگ کمیشن کے ٹائپ شدہ مسودے کا گمان ہو رہا تھا اور مجھے بھی کچھ یقین ہونے لگا کہ

؎ جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

غیرت اور ہمّت نے بازوؤں میں جوش مارا۔ مَیں نے اپنے کمرے کی زبوں حالی پر نظر دوڑائی۔ اور غصّے سے کپکپا اُٹھا۔ اور پھر خیال آیا کہ اِس ذلیل گھر میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی بلیک مارکیٹ شروع کر دے یا گاندھی جی کے نام پر فنڈ جمع کرنا شروع کر دے۔ اور اگر گاندھی جی کا نام فروخت کرنے میں کوئی قباحت ہو تو پھر سونا سمگل کرے۔ کچھ تو کرے۔ یُوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا تو بزدلی ہے۔

'ایمان داری سے تعمیر!' بیوی کے یہ الفاظ سُن کر مجھے خیال آیا کہ زندگی بھر میں ایمان داری کے سوا اور آخر کیا جھک مارتا رہا ہوں ——— چنانچہ میں نے بیوی کے پاؤں تلے سے زمین نکلنے کے لئے کہا ———

" تمہی بتاؤ کہ ایمان دارانہ تعمیر سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ "

" مطلب یہ ہے کہ ہم کسی سے قرضہ لیکر نیا پلان بنا کر یہ تعمیر شروع کر دیں۔"

نسلی طور پر میں قرض کو محبّت کی قینچی سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ قرض لیتے ہی گردن جُھک جاتی ہے اور اُس وقت تک جُھکی رہتی ہے۔ جب تک قرض ادا نہ ہو جائے اور قرض کی ادائیگی میں عام طور پر نوّے فیصدی کیس فیل ہوتے ہیں۔ اس لئے مرتے دم تک گردن جھکائے رہنا پڑتی ہے۔ البتہ بعض کتابوں میں یہ بھی پڑھا تھا کہ آج کل برابری کی شرائط پر بھی قرض لیا جاتا ہے اور تعمیر کے دوران میں سر کو اکڑا کر رکھا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی آج کل جمہوری مساوات کا شور بہت مچایا جاتا ہے۔ اس لئے کیوں نہ میں بھی اِس شور و غُل سے فائدہ اُٹھاؤں اور مساوی بنیادوں پر کسی سے قرض لے کر گھر کی تعمیر شروع کر دوں۔ میں نے بیوی کی اِس تجویز پر صاد کیا۔ اور اُسے اپنے پیچھے لگا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اور ہم دونوں میاں بیوی ——— اِتفاق رائے سے اپنے علاقہ کے نامی گرامی سیٹھ مٹھو مل طوطا رام اینڈ سنز موٹر مرچنٹس اینڈ جنرل مرچنٹس اینڈ نیشنل اینڈ انٹرنیشنل مرچنٹس کی دکان پر جا پہنچے۔

سیٹھ جی ایک لمبے سے چوبی تختے پر گاؤ تکیہ لگائے کسی تازہ فلمی رسالہ کا اشتہار پڑھنے میں مصروف تھے۔ ہم نے مودبانہ سلام کیا۔ سیٹھ جی

اشتہار پڑھتے رہے۔ ہم نے پھر مودبانہ سلام کیا۔ وہ اشتہار پڑھتے رہے۔ ہم اُن کے چہرے کو پڑھنے لگے۔ مساوات کے کوئی آثار نہیں تھے۔ لائف اور مساوات مساوات مساوی لائف۔ لائف جمع مساوات۔ مساوات ضرب لائف۔ لائف نفی مساوات۔ لائف تقسیم مساوات ـــــ نتیجہ ہر حالت میں صفر نکلا۔ اس لئے ہم دونوں چٹائی ہی پر بیٹھ گئے۔

ہمارے چٹائی پر بیٹھتے ہی سیٹھ جی منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

میں نے کہا ـــــ "سیٹھ مٹھو مل طوطا رام جی! میں اس ملک کا بہت بڑا ادیب ہوں۔ لیکن کسی غلط فہمی کی وجہ سے مجھے ایک بہت چھوٹا اور گھٹیا گھر ملا ہُوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ۔۔۔۔"

سیٹھ مٹھو مل طوطا رام نے میری بات کاٹ کر کہا ـــ "کھیں! کھیں!! کھیں!!!"

میں نے کہا ـــ "سیٹھ جی بعد میں ہنس لیجئے گا۔ پہلے میری پوری بات سُن لیجئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے گھر کی تعمیر کے لئے ایک نیا پلان بنائیں اور آپ قرضہ دے کر اس پلان میں ہماری امداد کریں۔"

سیٹھ طوطا رام نے پھر کہا ـــ "کھیں۔ کھیں۔ کھیں۔ مسٹر ادیب! لیکن بظاہر تو تم لوگ بالکل مُفلس و نادار دکھائی دیتے ہو۔ تم لوگ کیسے گھر تعمیر کر سکو گے"

میں نے کہا ـــ سیٹھ جی آپ نے ہمیں پہچاننے میں غلطی کھائی ہے۔ ہم مُفلس ضرور ہیں۔ لیکن ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

سیٹھ مٹھومل طوطارام نے ناک بھوں چڑھا کر کہا ـــــ "ہم تماشہ ضرور دکھایا کرتے ہیں مگر ٹکٹ لگا کر دکھاتے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے پاس ٹکٹ خریدنے کے لئے پیسے ہیں؟"

مَیں نے گڑگڑا کر جواب دیا ـــ "جی نہیں۔ فی الحال تو ہمارے پاس پلان ہی پلان ہے۔ پیسہ تو آپ سے لینا ہے۔"

"ہوں!"

سیٹھ مٹھومل طوطارام گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا۔ میری بیوی نے مجھے کہنی ماری کہ کام بن گیا ہے۔ مَیں نے سانس روک لیا۔ سیٹھ جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کہا ـــ

"دولت! نہ جانے پرماتما کی کیا مرضی تھی کہ جہاں مجھے اِتنا دھن دے دیا۔ وہاں ایک ایسا جگر بھی دے دیا جس میں سارے جہان کا درد بھرا ہُوا ہے۔ جب میں لوگوں کے شکستہ اور بوسیدہ گھر دیکھتا ہوں۔ تو اپنی یہ بلڈنگ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ یا تو یہ بلڈنگ نہ رہے یا پھر لوگوں کے یہ بوسیدہ گھر نہ رہیں۔"

مَیں نے کہا ـــــ "سیٹھ جی جمہوری مساوات اسی کا تو نام ہے۔ آپ ہی لوگوں کے دم سے تو یہ تھوڑی بہت انسانیت اور جمہوریت کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک گائے کے سینگوں پر ہی یہ دُنیا کھڑی ہے۔"

"یہ مثل ہماری ہی گائے کے لئے مشہور ہے۔" سیٹھ مٹھومل طوطارام نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

سیٹھ جی کے اِس لطیف مذاق پر میں جھینپ گیا۔ کیونکہ سیٹھ جی کے اندر مجھے کوئی بہت بڑا فنونِ لطیفہ کا ماہر چھپا ہُوا دکھائی دے گیا۔ کسی کے گھر میں گائے کا ہونا کتنا مبارک ہے۔ گائے کا دُودھ ہی دراصل تخلیقی آرٹ کی بنیاد ہے۔

مَیں نے سیٹھ مٹھومل طوطارام کو رقیبانہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا ـــــ

"تو سیٹھ جی! پھر آپ ہمیں قرض دے رہے ہیں؟"

"ضرور دے رہا ہوں۔ میرا تو اصول ہی یہی رہا ہے کہ میرے روپے سے کسی کا بھلا ہو جائے۔ روپے کے علاوہ تو سبھی اِنسان بھائی بھائی ہیں۔"

میں نے کہا ـــــ

"پیارے بھائی جان! آپ درست فرماتے ہیں ـــــ اِنسان کی وسیع برادری میں روپے نے آکر خلل ڈال دیا ہے۔ ورنہ دولت چاہے آپ کے پاس رہے یا ہمارے پاس۔ ہیں تو چاندی ہی کے چند ٹھیکرے۔ اِنسان روپے کو پا کر اپنے بھائی بندوں کو ہی بھول گیا ہے۔ اِس لئے آپ ہمیں اپنے جیسا ہی گوشت پوست کا اِنسان سمجھ کر روپے دے دیجئے تاکہ ہم اپنے گھر کو بھی آپ کی عالیشان بلڈنگ ایسا بنا سکیں اور عالیشان بلڈنگوں کی ایک وسیع برادری کا سنگ بنیاد رکھ سکیں۔"

سیٹھ صاحب نے تھری کیسل کے ٹِن میں سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور پھر مجھے سگریٹ پیش کئے بغیر سگریٹ کا ٹِن بند کر دیا اور بولا ـــــ

"عزیز بھائی! روپیہ تو میں آپ کو جتنا چاہیئے ـــــ دے دیتا ہوں۔ لیکن اِس روپے کی واپسی کی سبیل کیا ہوگی؟ آپ تو خود مہذب اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ لین دین کے بغیر اِس جگ کا دھندا نہیں چل سکتا۔"

میں سیٹھ مٹھومل طوطارام کی اِس ـــــــ صاف گوئی پہ دیوانہ ہوگیا اور کہا ۔
" سیٹھ جی! میں دیانت دار آدمی ہوں آپ جس طرح بھی پسند فرمائیں گے۔ میں روپیہ واپس کردوں گا ۔ "

" اچھی بات ہے ۔" سیٹھ جی نے اطمینان کا سانس بھر کر کہا ـــ " لیکن ایک چیز اور ہے ۔ اور وہ یہ کہ سارا روپیہ میں ہی نہیں دوں گا ۔ کچھ روپیہ آپ بھی شامل کیجئے تاکہ مل جُل کر یہ تعمیر اُٹھائی جائے ۔ بھائی چارے کا بھی یہی تقاضا ہے کہ سارا بوجھ ایک بھائی پر نہ پڑے ۔ کیا آپ کے پاس کچھ روپیہ ہے؟ "

میں نے بیوی کی طرف دیکھا ۔ بیوی نے میری طرف دیکھا ۔ جواب ملا ـــ کہ گھر میں تین روپے سات آنے کا سرمایہ محفوظ ہے ۔ لیکن یہ حقیر سرمایہ تو شرمناک حد تک کم ہے ۔ دماغ پر زور ڈالا کہ شاید مزید روپوں کا کہیں سراغ مل سکے ۔ دماغ نے کورا جواب دیا ۔ بیوی کے کچھ گہنوں پہ جا کر نظر ٹھہری ۔ اِس کے علاوہ میری لائبریری کی کتابیں بھی تھیں ۔ جنھیں فروخت کرکے روپیہ حاصل کیا جا سکتا تھا ـــ پچھلے ماہ میں نے جو سُوٹ سلوایا تھا ۔ اُس سے بھی کچھ اُمید بندھ سکتی تھی ۔ چند برتن بھی ٹھکانے لگائے جا سکتے ہیں ۔ دونوں بچّوں کے فراک اور نیکریں بھی کام آ سکتی ہیں ۔ چھوٹی بچی نے ہفتہ بھر پہلے جو لکڑی کا گھوڑا خریدا تھا ۔ اُسے اونے پونے داؤں پر لگایا جا سکتا ہے ـــــ اس کا مطلب ہے ۔ سرمائے کا ایک معقول ـــــ ذخیرہ ہاتھ لگ سکتا ہے ۔

گھر کی تعمیر کے لئے قربانی کا جذبہ میرے اندر شدت سے اُبھر آیا ۔ لیکن میں نے احتیاط کے طور پہ سیٹھ مٹھومل طوطارام سے پوچھا ـــــ سیٹھ جی!

لیکن یہ بتائیے کہ گھر کی نئی تعمیر پر کل کتنا روپیہ خرچ کرنا پڑے گا۔ اور اُس میں سے مجھے کتنا ادا کرنا پڑے گا؟"

سیٹھ جی کو جیسے زبانی ہی یاد تھا۔ فوراً بول اُٹھے۔ "ایک اچھے گھر کی تعمیر کے لئے کم از کم پانچ ہزار روپے تو ضرور چاہئیں۔"

مَیں نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا اور پھر کہا ——

"ٹھیک ہے مَیں اس میں سے ایک ہزار روپے شامل کر سکوں گا۔"

اور پھر مَیں نے سیٹھ مٹھومل طوطا رام پر اپنی تنظیمی ذہانت کا رعب جمانے کے لئے اُسے یہ روپیہ حاصل کرنے کے وہ سبھی ذرائع بتا دیئے جنھیں ایک منٹ پہلے میرا دماغ سوچ چکا تھا۔ سیٹھ جی کی پہلے باچھیں کھلیں اور پھر یک دم بند ہو گئیں جیسے وہ کسی غم ناک خیال سے اُداس ہو گئے ہوں۔

مَیں نے کہا —— "سیٹھ جی! اُداس کیوں ہو؟"

بولے —— "سوچ رہا ہوں۔ ایک ہزار کم ہے۔ ڈیڑھ ہزار تو ہونا ہی چاہئے آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟"

"ساٹھ روپے ماہوار!"

"کافی ہے۔ ہر ماہ اُس میں سے بیس روپے ماہوار بھی اِس سرمائے میں شامل ہو سکتے ہیں۔"

سیٹھ جی کی اچھوتی ذہانت پر میں جھوم اُٹھا۔ تنخواہ والی یہ مد تو میرے ذہن سے اُتر ہی گئی تھی۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ باقی چالیس روپوں میں کھانا وانا کیسے چلے گا۔ پہلے ہی ساٹھ روپوں میں کھینچا تانی رہتی ہے۔ لیکن مَیں نے مایوس

ہونا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس مشکل سوال کو حل کرنے کے لئے میں نے پھر سیٹھ جی کی طرف رجُوع کیا اور کپکپاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

" سیٹھ جی! باقی چالیس لوگ کہاں سے کھائیں پئیں گے کیسے؟ "

سیٹھ صاحب سے کوئی جواب نہ بن آیا۔ خاموشی سے باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اپنا سوال واپس لیتے ہوئے سوچا کہ سیٹھ جی کو زیادہ تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ چالیس ہی ہیں رُوکھی سُوکھی کھا کر ٹھنڈا پانی پی لیں گے۔ لیکن صرف اِتنی سی رکاوٹ کی خاطر گھر کی خوبصورت تعمیر کو نہیں روکنا چاہیئے۔ میں نے سیٹھ جی سے کہا ــــ

" مجھے منظور ہے۔ اب آگے چلئے۔"

سیٹھ مٹھومل کی بند باچھیں پھر کھل گئیں۔ اور کہنے لگے ــــ

" اب آگے عرض یہ ہے کہ یہ تمام روپیہ آپ میرے پاس جمع کرا دیجئے۔"

" اور آپ کا روپیہ؟ "۔

" وہ تو میرے پاس جمع ہے ہی۔"

میری سمجھ میں یہ جمع در جمع کا سوال بالکل نہیں آیا۔ بظاہر تو منطق کے اصول کی روشنی میں یہ بات بے حد صحیح معلوم ہوتی تھی کہ تعمیر کا سارا روپیہ ایک جگہ جمع ہو جائے۔ تاکہ اطمینان سے تعمیر کا آغاز کیا جا سکے۔ لیکن پھر بھی ــــ پھر بھی کچھ عجیب سی بات لگتی تھی۔

میں نے کہا ــــ " تو سیٹھ جی! کیا آپ ہمیں قرض نہیں دیں گے؟ "

" عجیب بدھو ہو۔ کہہ تو دیا کہ ساڑھے تین ہزار روپے ہم دیں گے۔ اور وہ

قرض کی صورت میں ہی ہوگا۔ جو آپ کو واپس کرنا ہوگا۔"

سیٹھ جی کی اس دھمکی کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اگرچہ اب بھی یہ بات کچھ ٹیڑھی سی لگتی تھی کہ سیٹھ جی کا روپیہ تو سیٹھ جی کے اپنے پاس جمع رہے گا۔ لیکن واپس مجھے کرنا پڑے گا۔ کہتے ہیں بڑے آدمیوں کی باتیں بھی بڑی ہی ہوتی ہیں۔ اور بدھو عام طور پر بدھو ہی ہوتے ہیں۔ خیر زیادہ مغز پچی کی فرصت نہیں تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ میں ایک ہزار روپیہ تو تنخواہ کی قسط کی شکل میں پانچسال تک دیتا رہوں گا۔ لیکن ایک ہزار روپیہ نقد کیسے دے سکتا ہوں۔ میرے پاس تو ابھی صرف قابلِ فروخت اشیاء ہی موجود ہیں۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے پھر میں نے سیٹھ جی کی طرف رجوع کیا۔ اور سیٹھ جی نے یہ حل بتا کر میرے دماغ سے بوجھ اُتار دیا کہ جی۔ ٹی روڈ پر اُن کے ماموں صاحب کی ایک فرم ہے۔ جو پرانی اشیا کا کاروبار کرتی ہے۔ میں اپنی پرانی چیزیں اُس فرم کے ہاں جمع کرا دوں۔ اور سیٹھ مٹھومل طوطا رام جی ایک ہزار روپیہ میرے نام پر اپنے کھاتہ میں جمع کر دیں گے۔ مجھے اپنی چیزیں جانے کا اتنا غم نہ تھا۔ جتنی یہ خوشی تھی کہ ماڈرن لائف میں بڑی بڑی فرمیں ایسی کھل گئی ہیں۔ جو نہایت آسانی سے سوسائیٹی کی مشکلیں حل کر دیتی ہیں۔

بات آگے بڑھی۔ سیٹھ جی نے ایک کاغذ پر میری قابلِ فروخت اشیاء کی فہرست لکھی۔ قابلِ اعتراض دام لگائے۔ لیکن ایک ہزار کی میزان دیکھ کر مجھے اِن داموں پر بھی کوئی اعتراض نہ رہا اور میں نے دستخط کر دیئے۔ ایک اور کاغذ پر میں نے اِس مطلب کے دستخط کر دیئے کہ ہر مہینے میری تنخواہ میں سے سیٹھ جی

بیس روپے دفتر ہی سے براہ راست وصول کر لیا کریں گے اور مجھے ہر ماہ رقم جمع کرانے کی زحمت سے بھی بچا لیں گے۔

بات اور آگے بڑھی اور میں نے سوال کیا ۔۔۔ "مگر سیٹھ جی کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرے اور آپ کے سبھی روپے آپ ہی کے پاس کیوں جمع رہیں گے؟"

"نرے بدھو ہو!"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہاری سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی، کہ اتنا بڑا پلان جس کی تکمیل پر پانچ سال کا عرصہ لگے گا۔ اس کی آرگنائزیشن کون کرے گا؟ کیا تم کرو گے؟ تم جو عرصہ تیس سال سے ایک غلیظ سے تنگ و تاریک کمرے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکے۔"

"جی ہاں، جی نہیں!!"

میں نے بوکھلا کر دونوں جواب دے دیئے۔

"سنو!" سیٹھ جی نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ سارا روپیہ ہماری مرضی سے خرچ ہو گا۔ ہم ہی یہ دیکھیں گے کہ ہمارا روپیہ صحیح نقطۂ نگاہ سے خرچ ہو رہا ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ چاہتے ہیں۔ آپ کے گھر میں پانی کے لئے ایک ٹیوب ویل لگنا چاہیئے۔ لیکن ہم کہیں گے کہ ٹیوب ویل سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر روز آپ کے گھر دو سیر برف آنی چاہیئے!"

"بجا فرمایا!"

"اور ہمارا برف کا ایک کارخانہ ہے۔ یہ برف وہاں سے آئے گی!"

مَیں سپلے حادثہ منع ہوگیا۔ واقعی ٹیوب ویل لگانا بے معنی ہوگا۔ برف کا پانی زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔

" اور سُنیئے۔ اس ساری تعمیری اسکیم کا ایک انچارج رکھنا پڑے گا۔ میرا بڑا لڑکا راجکمار ابھی ابھی ولائت سے انجینئری کی تعلیم حاصل کرکے آیا ہے۔ ہم اس اسکیم کا چارج اُسے دے دیں گے اور اُسے پچاس روپے ماہوار الاؤنس دیں گے۔"

مَیں خاموشی سے سُنتا رہا۔ تو گویا اب سیٹھ منھومل طوطا رام کا لڑکا میرا ملازم ہوگا۔ خوشی اور غرور کی بات تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے مالک ہونے کا احساس ہونے لگا۔

" اس کے علاوہ ایک اکاؤنٹنٹ رکھنا پڑے گا۔ تاکہ حساب میں گڑ بڑ نہ ہو اور روپیہ خرد برد نہ ہو جائے۔"

" یہ کام آپ کے چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیں گے۔"

" مجھے منظور ہے۔ وہ بھی کھاتا کا ہوشیار ہے۔"

" ایک کلرک۔ ایک ٹائپسٹ، ایک منشی، ایک . . . . "

" ایک ٹیچر۔ ایک کانسٹبل اور ایک مجسٹریٹ۔" مَیں نے دل ہی دل میں کہا۔

" تو سیٹھ جی! کیا یہ سبھی ملازم تنخواہ دار ہوں گے؟ "

" اور کیا؟ مُفت کام کریں گے؟ "

" اور یہ سبھی آپ کے کُنبے کے افراد ہوں گے؟"

" اور کہاں سے آئیں گے؟ "

" کہیں سے بھی نہیں۔"

مَیں نے شکست تسلیم کر لی۔

جب یہ سبھی امور طے پا گئے اور میرے ذہن میں ایک نیا ماڈرن اور خوبصورت سا گھر اُبھرنے لگا۔ تو مَیں نے خرابیوں کی طرح جھوم کر کہا ــــ

"تو پھر سیٹھ جی! یہ تعمیر کب سے شروع ہو جائے گی؟"

"بس آج ہی سے۔ نئے گھر کی ضروری اشیاء کی ایک چالو فہرست میرے پاس ہے۔ سبھی چیزیں فوراً آتی جائیں گی۔ اور تعمیر اُبھرتی چلی جائے گی۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے ــــ"

سیٹھ مٹھومل طوطارام نے ایک فہرست میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو گھر کے لئے الماریوں کی ضرورت ہوگی۔ تو میرے چچا گھسیٹا رام بُوطارام فرنیچر مارٹ کو آرڈر دے دیں گے۔ سنگاردان اور زنانہ آرائش کی اشیا میرے بھتیجے نرگسی داس نارسی داس جنرل مرچنٹ کے ہاں سے آجائیں گی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے وغیرہ شری مٹھو طوطا کاٹن ملز سے آجائیں گے۔ اچار کے مرتبان اور کپڑے رکھنے کے سوٹ کیس اور لوہے اور تانبے کا باقی سامان ہماری لوکل ایجنسی گھسیٹا رام مٹھومل کراکری ڈیلرز سے لے لیں گے اور فرش پر قالین بچھانے کے لئے ہماری شکستہ لاری پر پڑا ہُوا ایک ٹاٹ ہے۔ جو بہت لمبا چوڑا ہے وہ اُتار لیں گے اور ۔۔۔۔۔"

مَیں نے بات کاٹ کر کہا ــــ

"سیٹھ جی! دفتر جانے کے لئے مجھے ایک لاری کی بھی تو ضرورت پڑے گی۔ وہ لاری بھی ہمیں دے دیجئے۔"

" جی نہیں ۔ وہ لاری ہفتہ بھر پہلے ایک اور گھر کی تعمیر کے لئے بُک ہو چکی ہے"
مجھے بے حد افسوس ہُوا ۔ کاش میں ایک ہفتہ پہلے آجاتا ۔ تو اپنے ہی لئے بُک کرا سکتا تھا ۔ سیٹھ جی نے میرے افسوس کو بھانپ لیا اور کہنے لگے ۔۔۔

" گھبرانے کی ضرورت نہیں ۔ دوسری مرتبہ کی تعمیر میں لاری کا بھی بندوبست کرلیں گے ۔ فی الحال اِس معمولی سرمائے میں لاری کی گنجائش نکلنا ممکن نہیں ہے ۔ ورنہ ہمارے گیرج نمبر ۸ میں ایک اور لاری کے بھی چند پُرزے پڑے ہیں ۔ "

سیٹھ سچ کہتا تھا ۔ چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں ۔ بہرکیف یہ سارے معاملے خوش اسلوبی سے طے پا گئے ۔ اور سیٹھ جی نے کہا کہ پانچ سال کے بعد ایک نہایت عالیشان گھر آپ کے پاس ہوگا ۔ مَیں نے سیٹھ جی کا شکریہ ادا کیا اور پُوچھا ۔۔۔

" سیٹھ جی ! ایک بات تو رہ گئی ۔ کہ آپ کے اِس روپے کی واپسی کا کیا طریقہ ہوگا ؟ "

" نہایت آسان ! گھر جب تیار ہو جائے گا ۔ اُس کے بعد ہر ماہ آپ کو پچاس روپے ماہانہ کے حساب سے یہ قرضہ چکانا ہوگا ۔ "

مَیں چلّایا ۔۔۔ " لیکن سیٹھ جی اِس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ مہینے بھر کی تنخواہ آپ کو دیتا جاؤں گا ۔ تو پھر مَیں ۔ میری بیوی ۔ میری ماں اور یہ بچے کھائینگے کیا ؟ "

" یہ سوچنا تو آپ کا اپنا کام ہے ۔ بھائی جان ! ہر آدمی کو اپنے کھانے پینے کا بندوبست خود ہی کرنا چاہیئے ۔ "

" اچھا سیٹھ مٹھومل طوطارام جی ! اگر مَیں یہ قسط آپ کو ادا نہ کروں تو ؟ "

"تو پھر قرضہ کے عوض اُس گھر کو ہم اپنے قبضہ میں لے لیں گے۔"

"تو گویا وہ گھر آپ کا ہو جائے گا۔"

"اور کیا؟ قرضہ تو آخر وصول کرنا ہی ہوگا۔"

مَیں پھر چلّایا ——— "تو سیٹھ جی! جب یہ گھر بالآخر آپ ہی کا ہو جائیگا۔ تو ہم کیوں یہ اپنا پلان لئے پھرتے ہیں؟"

میرے اِس سوال کا جواب سیٹھ جی سے نہ بن آیا اور ہم اُلٹے پاؤں لَوٹ آئے اور میری بیوی آج تک مجھے طعنہ دیتی ہے کہ ضرور ہم سے ہی کوئی غلطی ہوگئی۔ جس کی وجہ سے گھر کا تعمیری پلان دھرا رہ گیا۔

؎ الٰہی! غنچۂ امید بکشا

دہلی گائیڈ

مُصَنّفہ ہ مسکر لِفہ

خاکپائے دہلی حقیر فقیر **فکر تونسوی** عفی عنہٗ

(جملہ حقوق بحق پبلشر اور فرزندانِ پبلشر محفوظ!)

پیش لفظ

خاکسار مصنف مدت مدید اور
عرصہ بعید سے محسوس کر رہا تھا کہ ایک
کتاب موسومہ "دہلی گائیڈ" ایسی شکل و
صورت کی لکھی جائے جو دہلی میں وارد
کرنے والے مسافروں کو راہ مستقیم سجھائے
سو ہفتہ عشرہ کی عرق ریزی کے بعد نسخہ
مذکور تیار ہوگیا۔ اگر کسی مسافر کو نسخہ ہذا سے
ایک مرتبہ بھی دہلی کا رستہ مل جائے (تو میرا ذمہ)
تو میں سمجھونگا کہ یہ کتاب واقعی مفاد خاص و عام
میں ہے اور اس ناچیز مصنف کو انشاء اللہ یہ جرأت
نصیب ہوگی کہ وہ دہلی کے بعد چیچو کی ملیاں کی گائیڈ
بھی لکھے اور عند اللہ اور عند السرکار ماجور ہو۔
یعنی اجر پائے یعنی رائلٹی پائے۔ آمین ثم آمین

وجہ تسمیہ مسافروں کے لئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ شہر مذکور کا نام دہلی کیوں پڑا۔ کہتے ہیں کسی زمانہ میں ایک بادشاہ دہلاخان کے نام پر اس شہر کی بنیاد پڑی تھی۔ بعض مورخ اس بادشاہ کا نام دہلا سنگھ اور بعض دہلا رام لکھتے ہیں۔ بہرکیف بادشاہ کے اصل نام کی پوری تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی۔ اگرچہ اس تحقیق کے سلسلے میں اس شہر میں اکھتر (اے) مرتبہ ہندو، مسلم، سکھ فسادات بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک بات پر کسی کو اختلاف نہیں کہ یہ شہر کسی بادشاہ نے ہی بسایا تھا۔ اس دُنیائے آب و گل کی روایت یہی چلی آرہی ہے کہ شہر بادشاہ ہی بساتے ہیں۔ باقی لوگ جھک مارتے ہیں۔

محل وقوع یہ شہر ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ بادشاہ نے پہاڑی کے نچلے پر دہلی کا دہلا اسی لئے مارا تھا۔ تاکہ پہاڑی کے فراز پر بیٹھ کر میدان کے نشیب پر نہایت آسانی سے حملہ کیا جا سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بادشاہ ہمیشہ حملے کے لئے شہر بناتے ہیں۔ اور حملے کر کے شہر اُجاڑتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ اپنے دشمن کا خطرہ رہتا ہے۔ عام طور پر یہ دشمن نشیب سے اُٹھتا ہے۔ اور فراز کی طرف بڑھتا ہے۔ اس لئے بادشاہ لوگ فراز سے پتھر لڑھکاتے ہیں۔ چٹانوں کی اوٹ میں مورچے بناتے ہیں۔ قلعے بناتے ہیں۔ فصیلیں کھڑی کرتے ہیں۔ گولیاں

ے بعض مورخوں نے یہ تعداد ۱۷ لکھی ہے۔

برساتے ہیں۔ تیر چھوڑتے ہیں اور دشمن کو پسپائی کے لئے مجبور کرتے ہیں۔

چنانچہ آج بھی یہاں کے بادشاہ زادے اپنے جدِّ امجد کی STRATEGY پر عمل کرتے ہیں اور بلند پہاڑی پر بنے ہوئے آئینی مورچوں سے میدانی نشیبوں پر گولہ باری کرتے ہیں۔ نت نئے آرڈی نینسوں کی بوچھاڑوں سے دشمنوں کے کلیجے چھلنی کرتے ہیں۔ قحط اور وباؤں کے زہریلے بان چھوڑتے ہیں — بھاری بھرکم لفظوں کے پتھر لڑھکاتے ہیں۔ اور دشمن کو پسپائی پر مجبور کرتے ہیں۔

پہاڑی پر بنے ہوئے اِس شہر کے آغوش میں ایک دریا جمنا نامی بہتا ہے کہتے ہیں کہ بادشاہ نے دریا کے کنارے یہ شہر اس لئے بنایا تھا تاکہ اگر کبھی بادشاہ کو شرم آجائے تو پانی میں ڈوب مرے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اسے زندگی بھر شرم نہیں آئی، اور بے شرمی کے اس عالم میں اس نے دریا کے قریب ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ قلعہ میں جمرود کے بنوائے اور کنیزوں کو حکم دیا کہ وہ سامنے دریا میں ہر روز صبح نہایا کریں۔ کنیزیں نہایا کریں اور بادشاہ جمرود کے میں بیٹھ کر انہیں دیکھا کرتا۔ ایک شاہی مصوّر نے اس نظارہ کی ایک تصویر بنائی۔ جسے دہلا آرٹ اسکول کا شاہکار قرار دیا گیا۔ جب شرم نہ آئے تو ہمیشہ شاہکار جنم لیتے ہیں۔

دریائے جمنا اب بھی دہلی شہر کے آغوش میں بہتا ہے۔ قلعہ کے جمرود کے اب بھی قائم ہیں۔ مگر شاہی کنبہ اب نئی دہلی کی کوٹھیوں میں منتقل ہوگیا ہے۔ کنیزیں کاروں پر سوار ہوتی ہیں۔ ریستورانوں کی شراب گلگوں میں نہاتی ہیں اور یوروپین اور امریکی مصوّر ان نظاروں کی تصویریں کھینچ کر رسالوں میں چھپواتے ہیں اور دہلی کے لوگ دہلا آرٹ اسکول کے ان شاہکاروں کو خرید کر شاہی کنبہ کے مینک بیلنس

ہیں اضافہ بھی کرتے ہیں اور اپنی انتڑیوں کا کرب بھی مٹاتے ہیں۔

اس دریا کا ذکر شاستروں میں بھی آتا ہے۔ اس لئے احترام کے مارے کوئی اس کی طرف اُنگلی نہیں اُٹھاتا۔ کچھ ایسے نیک اور خدا ترس بندے اب بھی موجود ہیں۔ جو اس دریا کو بھگوان کا قہر سمجھتے ہیں۔ اور جب اس دریا کے پُل پر سے ٹرین یا بس گذرنے لگتی ہے تو مارے ڈر کے کپکپا اُٹھتے ہیں اور کپکپی کے اس عالم میں تانبے کے پیسے، لوہے کے چھلّے، خربوزے کی قاشیں اور مونگ پھلیاں دریا میں پھینک دیتے ہیں ـــــــ وہ کہتے ہیں کہ کسی دن اگر جمنا مائی کوپ میں آگئی اور دھرتی کے پاپیوں کو ڈنڈ دینے کا خیال اس کے ذہن میں اُبھرا۔ تو ٹرین اور پُل دونوں جمنا مائی میں جا پڑیں گے اور ہاہا کار مچ جائے گی۔

مگر دہلی کی تاریخ شاہد ہے کہ پُل کبھی نہیں ٹوٹا۔ ٹرین کبھی نہیں گری۔ جمنا مائی کو کبھی کوپ نہیں آیا۔ بلکہ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ دہلی اسٹیشن پر چھاپہ مار ٹی ٹی بابوؤں کو کوپ آجاتا ہے۔ اور وہ دہلی آنے جانے والے یاتریوں کو بغیر کرایہ سفر کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیتے ہیں اور ایک ہاہا کار مچ جاتی ہے ـــــــ

اس ہاہا کار کی آواز جمنا مائی تک کبھی نہیں پہنچی۔ پھینکے ہوئے تانبے کے سکّے، خربوزے اور مونگ پھلیاں خاموش رہتی ہیں۔ اور ہاہا کار صرف اسی وقت ختم ہوتی ہے۔ جب کہ یاتری مونگ پھلیوں کی بجائے اپنے رہے سہے پیسے ٹی ٹی بابوؤں کی جیبوں کو بطور دان ارپن کر دیتے ہیں۔ جمنا کا ذکر شاستروں میں آیا ہے ٹی ٹیوں کا ذکر ریلوے ایکٹ میں آیا ہے۔ مسافر دونوں سے ڈرتے ہیں۔ دونوں کو دان دیتے ہیں اور پھر برلا مندر میں جاکر زور زور سے بھگوان کا بھجن گاتے ہیں اور

کہتے ہیں۔

چڑی چونچ بھر لے گئی ندی نہ گھٹیو نیر
دان دیئے دھن نہ گھٹے کہہ گئے بھگت کبیر

حدود اربعہ

دہلی کی حدود تلاش کرنا آسان کام نہیں۔ ممکن ہے، کسی زمانے میں اس کی چار حدیں رہی ہوں۔ مگر آج کل تو یہ حدوں سے باہر نکل گئی ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو یوں لگتا ہے کہ یہ شہر حد درجے کا بے حد و حساب ہو کر رہ گیا ہے اور ہر حد، حد ما است بنتا جا رہا ہے۔ اور جب سے اس شہر میں شرنارتھی آ کر بسے ہیں۔ اُس وقت سے تو دہلی شہر کی حدود شرنارتھیوں کے جھونپڑوں کی مرہونِ منّت ہو کر رہ گئی ہیں۔ آج اگر ایک شرنارتھی نے دہلی سے چھ میل پر ایک جھونپڑا بنا کر شہر کی حد بند کر دی تو دوسرے دن کوئی دوسرا شرنارتھی اس سے دو میل پرے جھونپڑا ڈال دیتا ہے۔ اور حد پھر بدل جاتی ہے۔ گویا دہلی کا حدود اربعہ شرنارتھی ہو کر بھٹک رہا ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اور اس طرح یہاں وہاں حدیں بن رہی ہیں۔ بگڑ رہی ہیں ——

ویسے مسافروں کی جزوی رہنمائی کے لئے چند موٹی موٹی حدود کا ذکر کرنا غیر مناسب نہ ہو گا۔

مشرقی حد

دہلی کے مشرق میں جمنا بہتی ہے۔ مگر جمنا کا پُل بننے کی وجہ سے یہ قدرتی حد ٹوٹ گئی ہے۔ اور آج کل اس کی مشرقی حد پر شاہدرہ ہے، گاندھی نگر ہے، غازی آباد ہے۔ شاہ۔ گاندھی۔ اور غازی تینوں حکمران نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان شاہی بستیوں میں حکمران نسل

نہیں رہتی۔ بلکہ کلرک رہتے ہیں۔ ان بستیوں کو دہلی شہر کی سرائیں کہا جا سکتا ہے۔ کلرکوں کے غول کے غول صبح ان سراؤں سے نکلتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈبے لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ بناسپتی گھی سے تر بتر آلو ٹیاں اور پیاز اور اچار اور مولیوں کا سالن۔ وہ اپنی تنگ و تاریک اور غلیظ جھونپڑیوں سے نکلتے ہیں۔ بظاہر چاق چوبند ہو کر، سر پہ کنگھی پھیر کر، بوٹوں سے گرد جھاڑ کر۔ کوٹ کے ٹوٹے ہوئے بٹنوں پر پن لگا کر ——— وہ بڑی تیزی سے ٹرین کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہانپتے، کانپتے اور لڑکھڑاتے ہوئے تاکہ دہلی پہنچنے کے لئے وہ کسی نہ کسی طرح ٹرین کے ڈنڈے کو ہی پکڑ لیں۔ انہیں بھوک نہیں ستاتی بلکہ نوکری چھوٹنے کا غم ستاتا ہے۔ صاحب کی گھڑکیوں کا خوف ستاتا ہے۔ انہیں یہ خوف نہیں ستاتا کہ ٹرین پٹڑی سے اتر جائے گی۔ بلکہ یہ خوف ستاتا ہے کہ دفتر کی گھڑی بہت تیز کیوں چلتی ہے۔ وہ دہلی میں نہیں رہتے بلکہ "مہذب شہریوں" کی طرح ان بستیوں میں رہتے ہیں۔ کیونکہ دہلی میں مکان نہیں ملتا۔ مگر شاہدرہ میں مل جاتا ہے۔ اور تنخواہ کا دس فی صدی دے کر مل جاتا ہے ——— وہ دہلی شہر میں نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ وہاں مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ نہیں رہتے۔ بلکہ وزیر رہتے ہیں، سفیر رہتے ہیں، بلیک مارکیٹیئر رہتے ہیں۔ سوداگر رہتے ہیں۔ مگر شاہدرہ میں نیک اور شریف کلرک رہتے ہیں۔ بناسپتی گھی کی روٹیاں اور بھی بھنی بیوی کی جھڑکیاں کھانے والے ——— اسی لئے دہلی کی مشرقی حد بڑی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ جو دہلی کے بڑے بڑے دفتروں کی فائلوں میں بن رہی ہے۔ اور تاریخ ساز جوارات

بھر ان سراؤں میں رہتے ہیں اور دن نکلتے ہی دہلی کی طرف بگ ٹٹ بھاگتے ہیں تاکہ اس دن کی تاریخ کے صفحے کورے نہ رہ جائیں۔ اور دہلی کی شاہی نسل کے افراد تاریخ کے ہیرو بننے سے محروم نہ رہ جائیں۔

شاہدرہ کا پانی کھارا ہے۔ اور کڑوا ہے۔ مگر اس کے پہلو میں بہتی ہوئی جمنا ندی کا پانی میٹھا ہے اور لذیذ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ —— ایک روائیت ہے کہ کسی فقیر نے جمنا مائی کو سراپ دیا تھا کہ تیرے پہلو میں زہر پیدا ہوگا۔ فقیر کے اس سراپ کا خمیازہ جمنا مائی نہیں بلکہ شاہدرہ کے کلرک اٹھا رہے ہیں۔ کلرکوں کا خیال ہے کہ اگر واٹر ورکس لگ جائے تو فقیر کے سراپ کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ مگر —— شاہی نسل کا خیال ہے کہ واٹر ورکس پر زر کثیر صرف ہوتا ہے۔ اس لئے فقیر کے سراپ کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کی روحانی روایات کو توڑنا گویا کسی فقیر کا از سر نو سراپ مول لینا ہے۔

جنوب مشرقی حد جنوب مشرق میں ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ ہے۔ جنوب مشرق میں مرزا غالب کا مقبرہ بھی ہے۔ مگر کچھ فضول سا مقبرہ ہے۔ اصل مقبرہ تو شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں ہی کا ہے۔ غالب کا مقبرہ تو بس یوں سمجھئے بن گیا ہے۔ ورنہ کہاں ہمایوں اور کہاں غالب۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ اور کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی اور کہاں ...... (کہاں تک گنتے جائیں)

ہمایوں کے مقبرے کی حفاظت سرکاری گارڈ کرتی ہے اور غالب کے مقبرے کی حفاظت کبوتر اور بارش کے اولے کرتے ہیں۔ ہمایوں کے مقبرے

کو دیکھنے کے لئے اٹلی اور مصر تک سے شاہی خاندان کے افراد آتے ہیں اور اسے دیکھ کر "بدرم سلطان بُود" کا ترانا گاتے ہیں۔ مگر غالب کے مقبرہ کو دیکھنے کے لئے کوئی چھابڑی والا بھی اُٹھ کر نہیں جاتا۔ بعض لوگ مقبرے کی خستہ اور ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ دیکھ کر فرطِ غضب سے مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں اور ملکہ نورجہاں کے مقبرے والا یہ شعر غالب کے مقبرے پر تھوپ کر کفِ افسوس ملتے ہیں کہ ؎

بر مزارِ ما غریباں نے چراغ نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے

لیکن ـــــ چراغ میں ڈالنے کے لئے تیل ڈیڑھ روپے سیر ملتا ہے اور پھُول توڑنے والا حوالۂ پولیس کر دیا جاتا ہے اور پروانے آج کل صرف شمع آزادیٔ وطن پر مرنے کے لئے ریزرو کر لئے گئے ہیں۔ اور بُلبلیں نظر بندی ایکٹ کے تحت جیلوں میں بند رہتی ہیں۔ اِس لئے غالب کے مقبرہ پر چڑھانے کے لئے صرف ٹھنڈی آہیں باقی رہ گئی ہیں۔ چنانچہ غالب کے مقبرے کی اس حالت کو بدلنے کے لئے قسمیں کھائی جاتی ہیں ..... مگر ہمایوں کے مقبرے پر پلاؤ اور مُرغِ مُسلّم کھائے جاتے ہیں اور یوں غالب کو ابھی تک اپنے اس شعر کی سزا مل رہی ہے کہ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جنوبی حد | دُور جنوبی حد پر قطب صاحب کا مینار ہے۔ ہندوستان میں

جتنی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان سب میں اس مینار کی کہانی پڑھائی جاتی ہے۔ جب یہ مینار گر جائے گا۔ اس وقت بھی تاریخوں میں یہ کہانی پڑھائی جائے گی سوائے اس کے کہ یہ مینار لمبا ہے۔ اس میں اور کوئی خصوصیت نہیں۔ نہ جانے لمبی چیزوں کو ہمیشہ تاریخ میں کیوں نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ پچھلے زمانہ میں ممکن ہے، اس مینار پر چڑھ کر بادشاہ لوگ اپنی ہندوستان کی وسیع سلطنت کا جائزہ لیا کرتے ہوں۔ مگر آج کل یہ مینار ناکام عاشقوں اور بے روزگاروں کے لئے خودکشی کرنے کا مقبول عام ذریعہ بن گیا ہے۔ جب تک عشق ناکام ہوتا رہے گا۔ اور ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں میں بے روزگاروں کی لسٹ کا نمبر بڑھتا رہے گا۔ قطب صاحب کا مینار قومی سیوا کا یہ کام خوش اسلوبی سے کرتا رہے گا۔

دہلی کی آدھی آبادی نے قطب صاحب کا یہ مینار نہیں دیکھا۔ کیونکہ ٹرانسپورٹ سروس والے وہاں تک آنے جانے کا ایک روپیہ پانچ آنے چارج کر لیتے ہیں۔ ایک روپیہ پانچ آنہ میں دہلی کے موجودہ فرخوں کے مطابق پورے دو سیر دال آجاتی ہے۔ اس لئے دہلی کے پچاس فی صدی باشندے قطب صاحب کی بجائے بازار سے دال لے آتے ہیں۔ اور گھر آکر قطب صاحب کی لاٹ کی تصویر کتابوں میں دیکھنے لگتے ہیں اور تصویر دیکھ کر اس بات پر بے حد اظہار افسوس کرتے ہیں کہ آہ! مینار کے اُوپر لے دو بُرج اگر نہ گرتے تو اس مینار کی عظمت کتنی بڑھ جاتی ——— قطب صاحب اور دال میں یہ کڑا اقتصادی مقابلہ آئندہ چل کر کونسا پلٹا کھائے گا۔ اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن آثار بتاتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی گُل ضرور کھلے گا۔

مغربی حد دہلی کی مغربی حد پر کسی زمانہ میں چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے اور چٹانیں ہُوا کرتی تھیں۔ بادشاہ لوگ جب شکست کھا جاتے تھے۔ تو ان پہاڑیوں کی طرف بھاگ جاتے تھے۔ آج کل بادشاہوں کے پاس ہوائی جہاز ہیں۔ اس لئے وہ پہاڑیوں کی طرف بھاگنے کی بجائے ہوائی جہاز پر چڑھ کر لندن یا نیویارک چلے جاتے ہیں۔ اور اُن کی بجائے لوگ ہی شکست کھا کر ان پہاڑیوں کا رُخ کرتے ہیں اور پناہ لیتے ہیں ——— اس سمت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بھاگے ہوئے لوگوں کو اپنی طویل اور وسیع آغوش میں چھپا لیتی ہے۔ جن لوگوں کو دہلی میں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی۔ چلنے کے لئے سڑک فارغ نہیں ملتی۔ پینے کے لئے گھنٹوں پانی کی باری نہیں آتی۔ کھانا پکانے کی انگیٹھی رکھنے کے لئے ڈیڑھ فٹ زمین نہیں ملتی۔ وہ لوگ ان چیزوں یعنی ان نئے دشمنوں سے شکست کھا کر مغربی سمت کو بھاگ جاتے ہیں۔ اور دُور دُور تک پھیل جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یُوں لگتا ہے۔ جیسے مغربی اُفق خود اس بڑھتی پھیلتی اِنسانیت کی لپیٹ میں آنے کو ہے۔ اور ایک کلرک نے اس اُفق پر اپنا کمرہ بنا لیا ہے۔ اور سوچ رہا ہے کہ یہاں سے اگر وہ اپنے سکریٹریٹ کے دفتر تک پیدل جائے۔ تو کیا وہ چار گھنٹوں میں دفتر پہنچ جائے گا۔ اور اس طرح بس کے آٹھ آنے بچانے میں کامیاب ہو سکیگا ——— چنانچہ حساب لگا کر وہ پیدل چل پڑتا ہے اور لہک لہک کر غالب کا یہ شعر پڑھنے لگتا ہے کہ

؎ منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

شمالی حد دہلی کی شمالی حد پر اولڈ سکرٹریٹ ہے اور اُونچے نیچے جنگل ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ اور بنگلے اور کوٹھیاں اور بینک اور سرکاری و غیر سرکاری دفاتر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جنگلوں میں گھری ہوئی یہ کوٹھیاں اور دفاتر یوں لگتے ہیں۔ جیسے جنگل میں منگل داخل ہو گیا ہو۔ کبھی کبھی اس منگل میں سنیچر بھی داخل ہو جاتا ہے۔ مگر سنیچر کے پاس نہ کار ہوتی ہے نہ پٹرول، نہ کسی بینک میں اکاؤنٹ ہوتا ہے، نہ کسی بنگلے کی حسینہ سے راز و نیاز۔ اس لئے وہ شمالی سمت میں بہت کم جاتا ہے اور اگر جاتا ہے تو سائیکل راستہ میں پنکچر ہو جاتی ہے۔ سن سٹروک ہو جاتا ہے اور وہ آدھے رستہ میں جا کر نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔

اس لئے یہ حد عام طور پر دشمنوں سے محفوظ رہتی ہے۔ اور سکون حُسن کے ساتھ منگلا چار میں مگن ہے۔ مسافروں کو چاہئے کہ ادھر کا رُخ نہ کریں۔ تاکہ اس حد کا عیش کہیں منغض نہ ہو جائے۔

متفرق حدود ان چند موٹی موٹی حدود کے علاوہ دہلی کا ایک متفرق حدود اربعہ بھی ہے۔ جو کھونٹ کھونٹ پھیلا ہُوا ہے۔ اور ہر ایک کھونٹ ایک ایسی حد ہے، جسے اگر تسلیم نہ کیا گیا تو وہاں کے باشندے ناراض ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ جمنا کنارے کے کسی بھی حصّہ پر کوئی بھی سادھو مہاشے بھنگ گھوٹنے، چرس پینے، تیل مالش کرنے ڈنٹر پیلنے، بھگوان کی آرتی اُتارنے اور نوسر بازی کرنے کے سماجی فرائض سرانجام دے رہا ہے وہ بھی اپنے آپ کو دہلی کی سرحدی چوکی سمجھتا

ہے۔ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی سرحدی چوکیوں کی تعداد کتنی ہے۔ اور ان کی حفاظتی نوعیت کی کیا قدر و قیمت ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان چوکیوں کی بدولت دہلی کے اِرد گرد ایک بے ساختہ قسم کی ڈیفینس لائن بن گئی ہے۔

اور دہلی کی اس ڈیفینس لائن کے پس منظر میں ہر مہینے دو چار نئی بستیاں جلوہ فرما ہوتی جا رہی ہیں۔ اور انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ دہلی کے پوتے پوتیاں اور پڑپوتے، پڑپوتیاں ہیں۔ اور دہلی ایک آل اولاد والی معزز اور خاندانی خاتون کی طرح ان کی نشوونما اور پرورش کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہی ہے۔ کئی شیطان صفت لوگوں کا کہنا ہے۔ کہ یہ بھوکی اور بے برگ و گیاہ بستیاں ہندوستان کے کونے کونے سے اُٹھ کر دہلی کی طرف بھاگ نکلی ہیں اور دہلی کا خاندانی لہو پی پی کر موٹی ہو رہی ہیں۔ اور موٹاپے کا یہی چسکا اگر چند سال قائم رہا۔ تو ایک دن سارا ہندوستان دہلی کے اِرد گرد چھاؤنیاں ڈال دے گا۔ اور یہاں کورو کشیتر کا سا رَن پڑے گا۔ ان بستیوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہی خیال آتا ہے کہ انہوں نے دہلی کو یوں گھیر رکھا ہے۔ جیسے لنگر خانے کو بھکاریوں نے گھیر رکھا ہو۔

آب و ہوا دہلی کی آب و ہوا گرم ہے نہ سرد۔ بلکہ گرم و سرد چشیدہ ہے یہاں کے لوگ زبان کے گرم اور دل کے سرد ہیں۔ اور آب و ہوا کا یہ حال ہے کہ آب گرمیوں میں کم اور سردیوں میں عام ملتا ہے۔ اور ہوا گرمیوں میں ہوا ہو جاتی ہے اور سردیوں میں دھول بن کر آنکھوں میں پڑتی

ہے ـــــ ہوا عام طور پر یا مقبروں پہ اُڑتی ہے یا بجلی کے تاروں میں سے چوری چھپے گزرتی ہوئی بنگلوں وغیرہ میں کہیں گھس جاتی ہے۔ رات کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے اگر آپ اردو پارک یا کناٹ پلیس یا کمپنی باغ کے پلاٹوں میں دو بجے کے قریب خراٹے لے رہے ہوں ۔ تو اچانک ڈیوٹی کانسٹیبل کے دماغ میں بھی ہوا بھر جاتی ہے۔ اور وہ خالص دہلوی لہجے میں آپ کو کان سے پکڑ کر اُٹھا دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔" اُٹھو میاں ذرا جیل کی ہوا کھاؤ۔" ـــــ جیل کی ہوا کو قانون میں دفعہ ۱۰۹ یعنی آوارہ گردی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

دہلی کی آب و ہوا کی کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم کا اپنا اپنا ایک خطّہ ہے۔ ایک خطّے کی آب و ہوا دوسرے خطّے میں داخل نہیں ہوتی ۔ اور اگر بھولے بھٹکے سے جا نکلتی ہے تو اس کی طرف دوسرے خطّے کی آب و ہوائیں دیکھتی ہے جیسے یہ ایسی سینما یا کوہ ایلیس سے نسلی منافرت پھیلانے آئی ہو۔ مگر اُسے دھتکارا نہیں جاتا ۔ اُسے چمکارا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ یوں جمہوری قسم کا سلوک جاتا ہے۔ جیسے بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

ایک ہوائی خطّہ خالص سیاسی کہلاتا ہے۔ جہاں نت نئے غبارے چھوٹتے اور پھٹتے رہتے ہیں۔ جو غبارے چھوٹتے ہیں وہ یکدم تیزی کے ساتھ آسمان پر اُٹھ جاتے ہیں ۔ اور پھر اپنی جائز بلندی پر جا کر پھٹ جاتے ہیں اور اس کی دھجیاں کسی سستے سے تنور پر جا کر اُتر جاتی ہیں اور کہتی ہیں ـــــ " لاؤ کھٹی دو روٹیاں قوم کی سیوا کے نام پر۔"

کبھی کبھی یہ غبارے ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں۔ اور بادلوں کی سی گرج پیدا کرکے چھینٹے اُڑانے لگتے ہیں۔ اگر چھینٹے میں جان ہوتی ہے تو پل بھر کے لئے فضا میں ایک تندی اور تیکھا پن آجاتا ہے۔ مگر اکثر یہ چھینٹے یوں اُڑتے ہیں۔ کہ کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ عام طور پر اس کرّہ میں ایسی آب و ہوا رہتی ہے۔ جیسے کوئی مداری چوراہے پر سانپ نکال کر ششدر کردے۔ کھیل دکھائے، پاپی پیٹ پر ہاتھ مارے، چادر پھیلائے اور پھر پیسے گن کر سانپ کو لوٹے میں سمیٹ کر چلتا بنے اور سوچنے لگے کہ بازی چت رہی کہ پٹ۔ اور اگر چت رہی تو کسی اگلے چوراہے پر جا کر پھر ٹرائی مارتا ہے۔ اور اگر پٹ رہی تو نئی دہلی کے کسی ریسٹوران میں جا کر جشن فتح مناتا ہے۔ یا چادر قدرے ہلکی نکلی تو جامع مسجد کے نیچے ہی کسی کبابیے کے ہاں کباب کھا کر یہ مصرع گنگناتا ہے کہ ؎

کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

ایک خطّہ شاعرانہ آب و ہوا کا خطّہ کہلاتا ہے۔ اِس خطّے کا مزاج کسی زمانہ میں بڑا گرم تھا۔ اور رستے میں پانی چھڑکاتے چھڑکاتے ایک سقّہ بھی چمڑے کی مشک کندھے پر لٹکائے اشعار کی آگ سے دِلوں کے الاؤ جلایا کرتا تھا۔ لیکن جب سے ملک آزاد ہُوا ہے۔ اِس خطّے کی آب و ہوا کو بھی سرکار کا سول سپلائی محکمہ بنا دیا گیا ہے۔ اشعار کی پھونکیں انڈین کانسٹی ٹیوشن کے مطابق ماری جاتی ہیں۔ سقّے اور پان فروش اور ٹین ساز وغیرہ کے سینے سے ہوک اُٹھتی ہے۔ تو وہ گلی کے کسی گوشے میں مُنہ چھپا کر اشعار کی ماچس

جلا لیتے ہیں۔ اور اس آب و ہوا کے خطّے کو قدرے گرم کر لیتے ہیں۔

اِس خطّے کی آب و ہوا میں گذشتہ کئی سالوں سے ایک نئی قسم کی آب و ہوا بھی آ کر شامل ہو گئی ہے۔ یہ آب و ہوا بنارس اور پریاگ کی وادیوں سے اُٹھ کر آئی ہے۔ اِسے عرفِ عام میں ہندی آب و ہوا کہتے ہیں۔ ابھی تک یہ آب و ہوا آل انڈیا ریڈیو کے بند کمروں میں ہی چکر کھاتی رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی جب میدانوں میں آ نکلتی ہے تو موسم کو خدا غیر متوازن کر دیتی ہے۔ اس آب و ہوا میں مٹھاس ہے مگر کھٹاس نہیں۔ موسم کے ماہرین کا خیال ہے کہ ابھی اس آب و ہوا کو کئی تھپیڑے کھانے پڑیں گے۔ جب جا کر شاید یہ کسی کروٹ بیٹھے گی۔

ایک اور خطّہ دفتری آب و ہوا کا ہے۔ یہ آب و ہوا نہایت معتدل قسم کی ہے۔ سالہا سال سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ چاہے دریائے جمنا میں باڑھ آ جائے یا ملکہ الزبتھ کو نور پہرا پہن لے۔ راشن کے آٹے میں کنکر ملا دیئے جائیں یا دہلی کلاتھ مل میں ہڑتال شروع ہو جائے۔ مگر اس خطّے کی آب و ہوا میں کبھی اتھل پتھل نہیں ہوتی۔ آپ اس آب و ہوا کو جب بھی سونگھیں گے۔ آپ کو وہی جانی پہچانی بو محسوس ہو گی ـــــ قلم اور کاغذ کی بُو۔ ٹائپ رائٹر اور ڈرائینگ کی بُو۔ تھکاوٹ۔ پیلاہٹ اور تھرتھراہٹ کی بُو۔ ایسی بُو جسے سونگھ کر جی چاہتا ہے کہ اس سے تو کہیں زیادہ اچھا ہے کہ آدمی سستی ہو جائے۔

ایک خطّہ ریلوے پُل کے پار بارہ کھمبے سے شروع ہوتا ہے اور پھر

کناٹ سرکس کے دائرہ میں ہی گھومتا رہتا ہے۔ اس خطے کی آب و ہوا صبح کو سرد، دوپہر کو خنک اور شام کو تر بتر ہو جاتی ہے۔ قہقہوں کی بارشیں ہوتی ہیں۔ تبسّموں کی بوندا باندی ہوتی ہے۔ جسموں کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ریشم و اطلس کی سرسراہٹوں اور ریفریجریٹروں کی گھن گرج اور وہسکی اور اسکاچ کی شعلہ طرازیوں سے موسم قاتل کنارہ بن جاتا ہے۔ اس آب و ہوا سے لذت اٹھانے کے لئے کئی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ وہ لوگ جن کا شجرۂ نسب ملکہ الزبتھ سے براہ راست ملتا ہے۔ وہ لوگ جن کے گھوڑے ریس کورس میں قومی ہیرو بن کر نکلتے ہیں۔ جو کالی مرچ کو کالے بازار میں بیچ کر پارلیمنٹ کے ممبر بن جاتے ہیں۔ جو روئی کو سٹے پر لگا کر ملک کی ٹکسٹائل انڈسٹری کو فروغ دیتے ہیں۔ جو لندن اور دہلی کے درمیان تار پیڈو کا کام کرتے ہیں، اور دیش کے باڈی گارڈ کہلاتے ہیں۔ جو وید اور قرآن کے حوالے دے دے کر سوم رس پیتے ہیں اور اس طرح مندروں اور مسجدوں کے ٹرسٹی بن جاتے ہیں۔

اور کبھی کبھی اس رنگین آب و ہوا کو انجوائے کرنے کے لئے کئی افلاک سے ٹوٹے ہوئے تارے بھی چمک مارتے ہیں۔ یہ کالج کے پروفیسر ہوتے ہیں ایڈیٹر اور ادیب ہوتے ہیں۔ ایکٹر اور فوٹو گرافر ہوتے ہیں۔ یہ وہاں گھوم کر افلاک سے اپنے ٹوٹنے کا ماتم کرتے ہیں۔ اس آب و ہوا کو تبدیل کرنے کے لئے مٹھیاں بھینچتے ہیں اور پھر یہ مٹھیاں کسی رنگ و نور میں شرابور حسینہ کی کفر شکن زلف دوتا کی طرف بڑھتی ہیں۔ کھلتی ہیں

اور پھر کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہیں ـــــ اور جب رات ڈھلے اُنہیں یہ آب و ہوا راس نہیں آتی تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور قلفی کا ایک سگرٹ اور ایک پان خرید کر "آرٹ کی توہین" کا غصّہ زمین پر تھوک دیتے ہیں۔ اور پھر جہاں سے چلتے ہیں، وہیں واپس آجاتے ہیں۔

پیداوار پیداوار کے اعتبار سے دہلی کی زمین قریب قریب بانجھ سی ہی ہے۔ یہاں جتنی بھی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ وہ سبھی دساور سے آتی ہیں۔ شرنارتھی دساور سے آتے ہیں۔ ٹرک دساور سے آتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبر دساور سے آتے ہیں۔ سیاسی لیڈر دساور سے آتے ہیں۔ دودھ دساور سے آتا ہے۔ مگر اس میں پانی دہلی ہی میں ملایا جاتا ہے۔ گندم امریکہ سے آتی ہے اور مٹی اور کنکر دہلی ہی آتی ہے۔ دھرم کاشی اور کعبہ سے آتا ہے۔ فسادات راولپنڈی۔ امرتسر اور ڈھاکہ سے آتے ہیں اور قوانین کے ڈھانچے لندن اور واشنگٹن سے آتے ہیں۔

کسی زمانے میں یہاں کی حقیقی پیداوار جس پر نواب واجد علی سے لے کر چھمّی جان کلکتہ والی تک کو فخر و ناز تھا، شاعری تھی۔ ایک ایک فٹ سے شعر اُگتے تھے۔ زمین کے ٹکڑے تک غزلیں اور شلوک کرتے تھے۔ اور اس پیداوار کی کھپت بڑی دُور دُور تک ہوتی تھی۔ لیکن جب سے چند محققین نے یہ راز فاش کیا ہے کہ اس پیداوار کا بیج دراصل مکّہ معظمہ اور مدّینہ منوّرہ سے درآمد کیا گیا تھا۔ اُس وقت سے دہلی کے باحمیت اور خاندانی زمینداروں نے اس کی پیداوار پر پابندی لگا دی ہے۔ اس لئے آج کل

اس کے بوٹے صرف کبھی کبھار جامع مسجد کے اِرد گرد یا گلی قاسم جان کے کسی کونے کھدرے میں اُگے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں۔ چائے کے ایک ایک کپ پر اس پیداوار کا غلہ ڈھیروں مل جاتا ہے اور لوگ باگ اسے یوں لے لیتے ہیں۔ جیسے کوئی ہاضمے کا چورن بطور سیمپل مُفت لے رہا ہو —— نتیجے کے طور پر اس محلّے کے کاشتکار چائے پیتے ہیں مگر چپاتی نہیں کھاتے — یادِ خدا میں مصروف رہتے ہیں اور پھر ناجائز شراب کا ایک آدھ پیگ پی کر مندرجہ ذیل قسم کے اشعار کے گاؤ تکیے لگا کر کسی فٹ پاتھ پر اپنا دستر خوان بچھا لیتے ہیں۔

ع شاعر ہیں ترے باپ کے نوکر تو نہیں ہیں

یا ع خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

یا شعر
میں نے شراب تو نے مروّت کا خون پیا
میرا قصور نرم ہے تیرے قصور سے

۲۔ شاعری کی پیداوار کے علاوہ دہلی کی سب سے بڑی پیداوار قوانین ہیں جو پارلیمنٹ کی وزارتی بینچوں پر سے اُگتے ہیں۔ اس جنس کو پیدا کرتے وقت خاص طور پر احتیاط کی جاتی ہے کہ اسے اپوزیشن کا کوئی کیڑا نہ لگ جائے۔ سال میں تین بار اس کی فصل تیار ہوتی ہے اور پھر ملک ہندوستان کے کونے کونے میں روانہ کر دی جاتی ہے اور لوگوں کو اس وقت پتہ چلتا ہے، جب یہ جنس ان کے باورچی خانے میں پہنچ جاتی ہے اور ایک کیڑے کی طرح اُن کے آٹے، سبزی اور برتنوں کو چاٹنے لگتی ہے۔

اس پیداوار کی عام کھپت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کسی کی ناک سے مکھی اڑانا چاہیں تو قانون تحفظ حشرات الہند کے ماتحت آپ کو مکھی اڑانے سے پہلے لائیسنس لینا ہوگا۔

۳۔ یہاں کی تیسری بڑی پیداوار سپنے ہیں۔ اس کی کھپت تانگے والوں نائیوں۔ موچیوں، کنجڑوں، پان فروشوں، اسکول کے مدرسوں، دھنیوں، دکانداروں اور طالب علموں کے ہاں عام ہوتی ہے۔ یہ غریبی کا مرض دور کرنے کے کام آتی ہے۔ ہر فصل کے بعد امیر اور زیادہ امیر ہو جاتے ہیں اور غریب اور زیادہ غریب۔ لوگ اسے خواب آور دوائی کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور خواب ہی خواب میں فورڈ کے کارخانے کے مالک بن جاتے ہیں۔ اور جب نیند اڑ جاتی ہے اور فورڈ کی موٹریں فل اسپیڈ پر بھاگ جاتی ہیں۔ تو وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگتے ہیں جو ایک ہی رات میں اتنی مدھم پڑ جاتی ہیں کہ انہیں دوبارہ ابھارنے کے لئے پھر خواب آور دوائی استعمال کرنا پڑتی ہے اور خواب در خواب کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آخرکار وہ فورڈ کے کارخانے کا مالک بننے کی بجائے اپنے گھر میں ہاون دستہ میں کوٹ کر سپنوں کی یہ دوائی تیار کر لیتے ہیں۔ اور پھر خوبصورت لیبلوں کے ساتھ بوتلوں میں بند کر کے مارکیٹ میں بھیج دیتے ہیں۔

باشندے

مثل مشہور ہے کہ دہلی کئی بار اجڑی اور کئی بار آباد ہوئی۔ پچھلی بار جب ۱۹۴۷ء میں وہ اجڑی تو اس کی آبادی دو لاکھ تھی اور جب پھر آباد ہوئی تو آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ اگر ایک بار

اور اسی طرح اُجڑی تو آبادی پچاس لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ دُنیا کے کسی شہر کو آبادی بڑھتے گھٹتے کا یہ تناسب نصیب نہیں۔ اسی لئے دہلی کے ایک شاعر نے لکھنؤ والوں کا منہ چڑانے کے لئے یہ شعر کہا تھا کہ

دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب ؎
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

اس گھٹتی بڑھتی آبادی میں دہلی کے اصلی باشندے کون سے ہیں؟ اس کا اندازہ لگانا آسمان میں تھگلی لگانے کے برابر ہے۔ یہاں کا ہر باشندہ دہلی کا نمک کھاتا ہے۔ مگر گن قندھار کے گاتا ہے۔ کسی کے والد محترم بنارس سے آئے تھے اور کسی کے پٹنہ سے۔ کسی کے دادا مرحوم شاہ سبکتگین کے دربار میں وزیر جنگ تھے۔ اور کسی کے حیدرآباد کے توشہ خانے میں داروغہ۔ کوئی صاحب چھچو کی ملیاں میں گنے کا رس بیچا کرتے تھے اور ایک سال جب گنے کی فصل خراب ہو گئی تو دوڑ کر دہلی آ گئے اور یہاں کباب بیچنا شروع کر دیا۔ کسی کے پردادا جان پشاور میں یونانی حکیم تھے اور دہلی میں کسی جڑی بوٹی کی تلاش میں آئے۔ تو خود دہلی کی جڑی بوٹی بن کر رہ گئے۔ اور جب دوبارہ اُبھرے تو دہلی کے چوراہوں پر قوتِ مردمی کا تیل بیچ رہے تھے ـــــ غرض کہ دہلی سب کی ہے۔ مگر دہلی کا کوئی نہیں۔ اس لئے دہلی کا اصلی باشندہ تلاش کرنا بے کار ہے۔ اور اگر کبھی کبھی آپ کو کوئی مردِ قلندر نما۔ دوپلی اوڑھے اُٹنگ پاجامہ ڈاٹے، کلّے میں پان دبائے ہنستی میں جاتا ہوا نظر آئے اور جیسے دو کہاروں نے بصد مصیبت اُٹھا رکھا ہو تو آپ کو شک

گذرے گا کہ دہلی کا حقیقی باشندہ ہے۔ چنانچہ آپ بے ساختہ اس کے قریب جاکر پوچھیں گے۔ تو معلوم ہوگا کہ حضرت کی دادی مرحوم دیوان مُول راج آف ملتان کی حرم سرائے میں باورچن تھیں۔

بہرکیف دہلی کے اُجڑنے اور بسنے کے وقفے میں دہلی کے باشندوں کی جو قسمیں بن چکی ہیں اُن کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ ان باشندوں کی ایک قسم یُوں ہو سکتی ہے کہ ہندو باشندے، سکھ باشندے، مسلمان باشندے اور عیسائی باشندے (چندہ وغیرہ وغیرہ باشندے) جب انگریز زندہ تھا۔ تو اس نے حکم دیا تھا کہ ہر اسکول میں صُبح کی دُعا کے وقت مندرجہ ذیل شعر قانونی حیثیت میں گایا جائے کہ ؎

ہندو مُسلم سِکھ عیسائی
سب آپس میں بھائی بھائی

چنانچہ جب تک انگریز زندہ رہا اور یہ دُعا پڑھائی جاتی رہی۔ اس وقت تک ہندو مُسلم سکھ عیسائی بھائی بھائی ہی رہے۔ لیکن چونکہ یہ شعر ایسٹ انڈیا کمپنی کا خریدکردہ تھا۔ اِس لئے جاتے وقت انگریز اسے ہندوستان میں کرایہ پر چڑھا گیا، اور آج کل اس شعر کا کرایہ اور سود ہر ماہ لندن بھیج دیا جاتا ہے۔ مگر اس شعر کی اب وہ قدر و قیمت نہیں رہی۔ اس لئے آج کل زیادہ تر اسکولوں میں مندرجہ ذیل شعر گایا جاتا ہے کہ ؎

ہندی، ہندو، ہندوستان
ہم کو بُدھی دے بھگوان!

دہلی نواسیوں کی ایک اور تقسیم یہ ہو سکتی ہے کہ پرانی اور نئی دہلی کے پرانے اور نئے باشندے۔ پرانی دہلی کے باشندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ بولتے وقت چارہ کاٹنے کی مشین معلوم ہوں گے۔ چلتے وقت بیلے کا پنگوڑا دکھائی دیں گے۔ چہرہ پر بسنتی رنگ کی بہار اور ہونٹوں پر کتھے کی لالی ہوگی۔ کبھی سے چار آنے قرض مانگنے جائیں گے تو آٹھ آنہ کی رکشا کر کے جائیں گے۔ کسی تھڑے پر بیٹھ کر بیڑیاں بنا رہے ہوں گے۔ مگر ململ کا نفیس انگرکھا پہن کر ——— ایک بار ان سے بہ سہیل تذکرہ پوچھ بیٹھئے کہ حضور کا دولت خانہ کہاں ہے؟ تو فوراً آپ کو دوسرے دن کے کھانے کی دعوت دے دیں گے اور پھر دعوت کا اہتمام اس آن بان سے کریں گے کہ بیوی کے جوتے تک گروی چلے جائیں گے۔

مگر نئی دہلی کے باشندے پرانی دہلی کے باشندوں سے بالکل اُلٹ ہیں وہ چارہ کاٹنے کی مشین کی طرح بات نہیں کرتے بلکہ چارہ کاٹنے کی مشینیں بیچتے ہیں اور بات اوّل تو کرتے نہیں اور اگر کرتے ہیں تو صرف مشین کا ریٹ بتانے کے لئے۔ وہ چلتے وقت پنگوڑا نہیں بن جاتے بلکہ وہ چلتے کم ہیں، کاروں اور بسوں اور جیپوں پر زیادہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ بہ سہیل تذکرہ اُن سے پوچھ بیٹھئے کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟ تو وہ آپ کو دعوت دینے کی بجائے آپ سے یہ پوچھیں گے کہ آپ اُس گھر کی پگڑی کتنے ہزار روپے دے سکتے ہیں؟ ——— اُن کے چہرہ پر بسنتی رنگ نہیں ——— بلکہ خونِ دو عالم سوار ہوتا ہے۔ اپنی ہر چیز کو چھپا چھپا کر رکھیں گے۔ آنکھوں کو عینک سے چھپائیں گے۔ ہاتھوں کو دستانوں سے۔ پاؤں کو جرابوں سے،

جسم کو اوورکوٹ سے ـــــــ نئی اور پرانی دہلی کے باشندوں میں وہی فرق ہے جو پرانی شراب اور نئی شراب میں ہوتا ہے۔ اور نئی شراب بھی وہ جو ناجائز طور پر کشید کی گئی ہو، اور "سستی، خوبصورت اور پائیدار" کے لیبل کے ساتھ بک رہی ہو۔ جام پر جام چڑھاتے جاؤ۔ مگر جب پی کر نکلو تو یوں محسوس ہو جیسے چائے کا ایک کپ پی کر نکلے ہیں۔

نئی دہلی کے باشندوں کا کلچر ابھی چک پھیریاں کھا رہا ہے۔ کئی دانشمندوں نے کوشش کی کہ اس کلچر کا کوئی رنگ روپ بن جائے۔ لیکن اس کلچر کی خمیر میں ابھی بہت گڑ بڑ ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے کسی مریض پر ہذیانی کیفیت طاری ہو۔ اس کلچر میں ایک حصّہ ایرا غیرا اور نتھو خیرا قسم کے کلچر کا ہے۔ ایسے غیروں کے نمائندے کلرک، وکیل، ڈاکٹر، ادنیٰ منیجر اور آرٹسٹ قسم کے لوگ ہیں۔ اگر یہ لوگ نئی دہلی کو چھوڑ جائیں تو نئی دہلی یوں لگے گی جیسے گولیوں کے بغیر خالی پستول ـــــــ ہر شام کو یہ چھوٹی ہوئی گولیاں پستول سے نکل کر اپنے اپنے "ڈیڈ اسٹاک روم" یعنی کوارٹروں کی طرف بھاگتی ہیں۔ پانچ بجتے ہی ان کے غول کے غول کوٹھیوں، سول سکریٹریٹ، بینکوں اور کمپنیوں کے دفاتر سے نکلتے ہیں۔ اور یہ منظر دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی بادشاہ نے دشمن پر فتح پالی ہے اور اس کی فوج کے دستے فتح کا علم یعنی سائیکل اڑاتے ہوئے اپنی اپنی "فرلو" پر جا رہے ہیں۔

نئی دہلی کے باشندوں کی ایک قسم شاہی نسل سے تعلق رکھتی ہے اور ان کا ذکر میں پہلے کر ہی چکا ہوں کہ ان کے سر پہ کوئی نہ کوئی کلغی ہوتی ہے۔ اور

اس کلغی کی خاطر یہ دہلی کو شرفِ رہائش بخشے ہوئے ہیں۔ اگر یہ کلغی اُتر جائے۔ تو دہلی کے ساتھ ان کی محبت کا بھانڈا پھوٹ جائے۔

نئی دہلی کے باشندوں کی ایک اور قسم "غیر ملکی" کہلاتی ہے۔ یہ چلتے پھرتے باشندے ہیں۔ بلکہ انہیں باشندے کی بجائے "بافندے" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ یہ پہلے جال بنتے ہیں اور پھر انہیں جگہ جگہ بچھا دیتے ہیں۔ ان جالوں پر بڑے دلکش لیبل لگاتے ہیں کہیں تبلیغِ انسانیت کا لیبل کہیں عالمگیر علم و دانش کا لیبل کہیں ڈپلومیٹک تعلقات کا لیبل، کہیں تمدنی تبادلہ کا لیبل۔ کہیں سیاحی کا لیبل اور کہیں ریسرچ کا لیبل ——— یہ آخری لیبل سب سے زیادہ دلچسپ اور مفید مطلب ہوتا ہے، یہ "ریسرچ اسکالر" قسم کے حضرات دہلی میں آتے ہیں اور اپنے کیمرہ سے بھیڑوں بکریوں، اور جھونپڑوں اور لیمپوں کے فوٹو کھینچ لیتے ہیں اور تین چار دن کی اس ریسرچ ہی میں ہندوستان کے کلچر اور تمدن پر ایک ضخیم کتاب لکھ دیتے ہیں جس میں وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہندوستان کی بھیڑیں صنعتی طور پر بے حد ترقی یافتہ ہیں۔

بہرکیف نئی دہلی کے یہ غیر ملکی باشندے چل پھر کر تماشہ دیکھتے ہیں۔ اور دہلی میں چلتے پھرتے یوں لگتے ہیں جیسے اردو غزل کے بے وفا معشوق۔

دہلی کے باشندوں کی ایک اور قسم بالکل اچھوتی قسم ہے انہیں شرنارتھی باشندے کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شکست خوردہ فوج کی طرح دہلی میں داخل ہوئے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں یہ فاتح فوجوں کی طرح دہلی پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ دہلی کے بعض متاثرہ قدیم باشندے ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں کہ ان شرنارتھی "ڈھگوں" نے دہلی میں آکر گند پھیلا دیا ہے۔ اور شرنارتھی لوگ فخر سے سینہ تان کر کہتے ہیں کہ ہم نے دہلی کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بہرکیف یہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ نئی اور پرانی دہلی کی قریب قریب ہر سڑک گلی اور بازار میں آپ کو شرنارتھی "ڈھگا" ہوا مل جائیگا۔

شرمارتھی باشندوں کی پہچان یہ ہے۔ کہ اُن کی بول چال میں ایک اکھڑا اکھڑا پن ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ہجر زدہ رات بھر جاگتا رہا ہو۔ رفتار ایسی جیسے کوئی پتنگ ڈور سے کٹ گیا ہو۔ مسکرانے کی کوشش کریں گے تو پھول کے ساتھ ساتھ بول بھی برسائیں گے۔ رونے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ خونِ نسوؤں کا کاروبار کرتے ہیں۔ چوبی کھوکھوں اور گھاس پھوس کے "بنگلوں" میں رہتے ہیں۔ اگر آپ کبھی دہلی جائیں اور آپ کے کانوں میں یہ آواز سنائی دے کہ ——— "میں نے تینوں آکھیا ہے کہ اُدھر کھیتے کو ہوندے ہوئے سیدھے کو چلیا جانا۔ تلی جامیا مسجد پر پہنچ جائیں گا۔" ——— تو آپ فوراً سمجھ لیجئے کہ یہ شرمارتھی ہے۔ اور دہلی کی زبان کے پتنگ کی ڈور بڑی محنت شاقہ اور خلوصِ دل سے کاٹ رہا ہے۔

قابلِ دید مقامات

دہلی کے قابلِ دید مقامات وہی گنے چنے ہیں۔ جنہیں آج تک کے سبھی معزز اور مستند مورخوں نے اپنی تاریخوں میں بار بار درج کیا ہے۔ یعنی وہی لال قلعہ، جامع مسجد، چاندنی چوک، پارلیمنٹ ہاؤس، انڈیا گیٹ یا اگر کسی مورخ نے زیادہ دیانتداری سے کام لیا تو چنتی قبر کا ذکر بھی کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسافر چاہے دہلی سے دو آنہ کے بھنے ہوئے چنے خرید کر اپنا پیٹ بھریں یا نہ بھریں۔ مگر لال قلعہ دیکھنے کے لئے دو آنے کا ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ اور قلعہ میں گھوم کر شاہانِ سلف کی عظمت و جرات کے کھنڈر دیکھ دیکھ کر کفِ افسوس ملتے ہیں اور قلعہ سے باہر

آکر اپنے دو آنوں پر کفِ افسوس ملتے ہیں ——— جامع مسجد دیکھنے کے لئے دو آنے کا ٹکٹ گھر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خدا کا گھر ہے۔ مگر خدا کے اس گھر کی لمبی چوڑی اونچی نیچی سیڑھیوں پر خدا کے خاص بندے یعنی فقیر ——— اہل ایمان اور اہل سخا کے انتظار میں آنکھیں اور ٹانگیں بچھائے اونگھتے رہتے ہیں ——— آنکھوں کا سُرمہ اور داڑھ کے درد کا علاج کرنے والے مجرب باز ہوتے ہیں۔ جو کہہ رہے ہوتے ہیں۔" بابا! دانت بڑی نعمت ہیں ——— اور خدا کے سامنے داڑھ کے درد لے کر جانا کفرانِ نعمت ہے" اور پھر کٹورے بجا بجا کر پانی پلانے کے لئے بلانے والے بہشتی ہوتے ہیں اور یہ سبھی حضرات خدا کے سائے میں بغیر ٹکٹ دیئے جنت کا راستہ دکھاتے ہیں اور پیسے، ٹکے، آنے اور کوڑیاں پاتے ہیں۔

یہی حال چاندنی چوک کا ہے۔ جہاں نہ چاندنی ہے نہ چوک ہے اور یہی حال انڈیا گیٹ کا ہے جہاں پر نہ انڈیا ختم ہوتا ہے اور نہ انڈیا شروع ہوتا ہے۔ اور یہی حال پارلیمنٹ ہاؤس کا ہے۔ جسے دیکھ دیکھ کر ہندوستان کی حیرتناک عظمت اور حیرتناک افلاس دونوں کا بیک وقت شدید احساس ہونے لگتا ہے۔

دہلی کے قابل دید مقامات میں سمادھیں اور مقبرے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ کی مرغی مرجائے یا غدر کا بچا کھچا شہزادہ خداوند خدا کو پیارا ہو جائے۔ دونوں کے مقبرے اور سمادھیں بنیں گی۔ اور ان پر ہر برس میلے لگیں گے۔ اور اگر میلے نہیں لگیں گے تو

کم از کم اس گلی، بازار یا سڑک کا ٹریفک ضرور روک دیں گے۔ کہتے ہیں مقبرے دہلی کے کلچر کا بلند حصّہ ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مُردہ چیزیں کلچر کی اُٹھان اور زندہ چیزیں کلچر کی گراوٹ کا باعث بنتی ہیں۔

مگر دہلی کے اصل قابل دید مقامات وہی ہیں۔ جن کا کسی تاریخی کتاب میں ذکر نہیں ہے۔ اور نہ حتی الامکان آئندہ ذکر کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک مقام وہ ہے جو مسجد فتح پوری اور گھنٹہ گھر کے درمیان فٹ پاتھ پر صبح کے وقت نمودار ہوتا ہے۔ اس مقام پر ہر صبح اچانک بیسیوں ننھی مُنّی دستی ٹی شاپس اُبھر آتی ہیں۔ یہ ٹی شاپس ایک میلے کچیلے چائے کے پاٹ، ٹین کے چند گلاسوں، چند روٹیوں اور اُبلی ہوئی دال سبزی کے ایک ایک تھال پر مشتمل ہوتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر رات بھر آرام کرنے والے معزز شہری، گداگر، بوٹ پالش والے، نائی۔ آوارہ گرد لونڈے، ملوں کو جانے والے مزدور۔ ریڑھیوں والے، رکشا والے، ــــــ غرض علاقہ کے سبھی "ملنگانِ کرام" مکھیوں کی طرح جمع ہو جاتے ہیں اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر "دسترخوانیت" پیدا کر لیتے ہیں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جس نے فٹ پاتھ بنائی، پھر چائے بنائی اور پھر ان کا پیٹ بنایا، جو صبح کے ناشتے کے بغیر اپنے آپ میں ہی نہیں آتا۔ اس مقام کو دیکھ کر اکثر مجھے غالبؔ کا یہ شعر انتہائی غلط اور مجہول معلوم ہوتا ہے کہ ؎

ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

دہلی کا ایک اور قابل دید مقام جس کا تاریخوں میں ذکر نہیں آتا ـــــ قطب روڈ ہے۔ اس جگہ کا نام سنتے ہی عورتیں مارے شرم کے گھونگھٹ کاڑھ لیتی ہیں۔ اور مرد آگا پیچھا دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دینے لگتے ہیں۔ ـــــ اور اگر مونچھیں نہ ہوں تو سر میں ہی اُنگلیاں پھیر کر گذارہ کر لیتے ہیں۔

قطب روڈ شیطان کی طرح مشہور ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہاں شیطان الیکشن میں بطور میونسپل کمشنر کامیاب ہوا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ شیطان کے قدیمی دشمن آدم کی بیٹیاں یہاں رہتی ہیں۔ جو چار چار آٹھ آٹھ آنے میں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ان عورتوں کے علاوہ خاص قسم کا پان بھی ملتا ہے۔ مگر پان دو پیسے میں مل جاتا ہے۔ اور عورت آٹھ آنے میں۔ پان کو کتھا لگا کر مرغ کیا جاتا ہے۔ اور عورت کو لپ سٹک لگا کر۔ لپ سٹک اگر چور بازار میں خریدی جائے یعنی کارپوریشن کے مقررہ ٹائم کے بعد چور دروازوں اور اندھیری راتوں میں خریدی جائے۔ تو ریٹ آٹھ آنے سے بڑھ کر پانچ روپے ہو جاتا ہے ڈبوٹی کانسٹیبل، دلال اور ٹھیکیدار کی منزلوں سے گذرتے گذرتے یہ پانچ روپے جب ـــــ رنڈی تک پہنچتے ہیں تو پھر وہی آٹھ آنے بن جاتے ہیں۔ یعنی جیسا منہ ویسی چپت بن جاتے ہیں۔ اور عورت اور مرد کی دیرینہ محبت کا ثبوت مہیا کر دیتے ہیں۔

بہرکیف قطب روڈ ایک قابل دید مقام ہے۔ کیونکہ یہاں نہایت صاف بیانی اور دیانت داری اور اس ہاتھ دے اور اُس ہاتھ لے، کے سسٹم

پر محبت کے معاہدے ہوتے ہیں۔ چند سر پھرے لوگ اسے قابل دید کی بجائے قابل نفرت مقام بھی کہتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کو آج تک منہ کی کھانی پڑی ہے (آئندہ کی رام جانے)

اسی طرح ایک اور قابل دید مقام نئی دہلی کا ریلوے پل ہے۔ اس پل کے اوپر نہائت قابل دید انسان رہتے ہیں۔ عام فہم زبان میں انہیں "بھکاری" کہا جاتا ہے۔ اگر بھکاری نہ ہوتے تو یہ پل دو کوڑی کا بھی نہیں تھا۔ لیکن اب اس پل کو دیکھنے کے لئے اہل ذوق آتے ہیں۔ اور ناک پر رومال رکھ کر گذر جاتے ہیں۔ ان بھکاریوں کی صفت یہ ہے۔ کہ یہ اس پل کے نیچے اپنی جوئیں مارتی ہوئی حسیناؤں سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ یہیں شب فراق کے تارے گنتے ہیں۔ یہیں بلیرڈ کھیلتے ہیں۔ یہیں ڈرائینگ روم۔ ڈریسنگ روم، اسٹیڈی روم، باتھ روم پیدا کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ شادی بیاہ تک یہیں کر لیتے ہیں۔ یہیں ان کی عدالتیں، جیلیں، جھگڑے اور فیصلے سرانجام پاتے ہیں ——— یہ لوگ صرف ایک ہی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اور وہ ہے ڈیوٹی کا ٹیبل کا ٹیکس۔ گورنمنٹ آف انڈیا کا دوسرا کوئی قانون، کوئی دفعہ، کوئی محکمہ ان کی شہری آزادی میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ یہ گداگر چاند میں داغ کی طرح رہتے ہیں۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا جانتی ہے کہ چاند میں تو داغ ہوتا ہی ہے۔

ایک اور قابل دید مقام ——— نئی دہلی کے شراب خانوں اور ریسٹورانوں کے برآمدے کہلاتے ہیں۔ ان برآمدوں میں آپ ایک دو بار

نہایت مشکوک طریقے پر گھومتے رہیئے۔ تو اچانک ایک نازک اندام حسینہ آپ کے پہلو سے گذرے گی۔ قطب روڈ کی آٹھ آنے والی عورت اور برآمدے کی اس نازک اندام حسینہ کے لب و لہجہ کے سوا باقی سب چیزیں "مخلوط" ہوں گی۔ جب سوسائیٹی پچھڑی ہوئی ہو۔ تو وہ قطب روڈ کی عورت کو پیدا کرتی ہے۔ لیکن جب ترقی یافتہ ہو جائے تو سوسائیٹی گرل پیدا کرتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مغربی زندگی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ مشرقی زندگی ہے۔ بہرکیف مشرق اور مغرب دونوں کے دلدادگان برآمدوں میں گھومتے ہیں۔ اور شراب کے پیگ اور لڑکیوں کے بوسہ میں مشرق اور مغرب دونوں کو غرق کر دیتے ہیں۔

آخری نوٹ:۔ اگر انسان کی آنکھ میں تکریے نہ ہوں تو دہلی میں اور بھی کئی قابل دید مقامات نظر آجائیں گے۔

ذرائع آمد و رفت دہلی کے لوگوں کی عام طور پر یہی خواہش ہوتی ہے کہ پیدل چلا جائے۔ ورنہ بغیر پیسہ دھیلہ دیئے سواری کی جائے۔ چنانچہ ان کی دونوں خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔۔۔ خواہش نمبر دو پوری کرنے کے لیئے وہ ٹرام کے عقب میں چوری چھپے چڑھ جاتے ہیں۔ اور چوری چھپے اُتر جاتے ہیں یا کار والوں سے لفٹ مانگ لیتے ہیں، یا کسی دوست کی سائیکل کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس لیئے جو لوگ شکائت کرتے ہیں کہ دہلی میں ذرائع آمد و رفت بیحد مہنگے ہیں، وہ صریحاً جھوٹ بولتے ہیں۔

دہلی کی سب دلچسپ سواری "ٹرام" ہے۔ اس سواری کی وجہ تسمیہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کس نقطۂ نگاہ سے چلتی ہے۔ اور اس بالائے صحرائی کی منزل کہاں ہے۔ ایک ماہر ٹرانسپورٹ کا خیال ہے کہ ٹرام چلتی ہے تو دہلی کی عظمت کا خوامخواہ احساس ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ کیونکہ ٹرام کو دیکھ کر واقعی ایک جھرجھری سی آجاتی ہے۔ اور جھرجھری ہمیشہ عظیم چیزوں سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

دہلی میں لبسیں بھی چلتی ہیں۔ اور واہ وا! کیا لبسیں چلتی ہیں۔ کہ بس چلتی ہی رہتی ہیں۔ مگر ہاتھ نہیں آتیں۔ اور جب ہاتھ بھی آتی ہیں تو قطار میں باری نہیں آتی۔ اور جب باری آنے لگتی ہے تو کنڈکٹر سیٹی دے دیتا ہے اور قریب کھڑا ہُوا تانگے اور رکشا والا معنی خیز طریقے پر مسکرا دیتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ بس، رکشا اور تانگہ سے بے نیاز ہو کر پیدل چلا جائے پیدل چلنے میں آخر قباحت بھی کیا ہے؟ ــــــ قباحت صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب مقام مقررہ پر پونے دو گھنٹے لیٹ پہنچتے ہیں۔ اور ذرائع آمد و رفت کا واحد ذریعہ یعنی جوتا جُل دے جاتا ہے۔ دہلی آنے جانے والے لوگوں کو چاہئے کہ جب وہ دہلی اسٹیشن پر اُتریں تو اپنا بٹوہ دیکھ لیں۔ اور جوتا بھی۔ اگر بٹوے میں تو سے روپے ہوں۔ تو ان میں سے پچاس روپے ایک الگ خانے میں ڈال لیجئے۔ اور اس پر ایک چٹ لکھ کر چپکا دیجئے ــــ "برسلسلہ ذرائع آمد و رفت۔"

معاشرت | اہل دہلی کی معاشرت میں غضب کی گونا گونی اور بوقلمونی

ہے۔ دہلی کے قدیم باشندوں کے گھروں میں گھس کر دیکھئے تو کسی بادشاہ کے محل سرا معلوم ہوں گے۔ اگرچہ پائجامے کی کنڈی ٹوٹی ہوگی۔ یہی پوقلمونیت ان کے لباس میں ہے۔ بند گلے کا کوٹ اور پائجامہ پہن کر باہر نکلیں گے اور پان میں چونا تیز کرکے نرم نرم بولنے کی کوشش کریں گے۔ عامۃ الناس بیڑیاں پیتے ہیں اور خاصتہ الناس پنچوان اور تمری کیسل کے سگریٹ پیتے ہیں۔ اگر گھر میں صرف ایک کمرہ ہوگا۔ تو چارپائی کے نیچے حرم سرا بنوالیں گے۔ مکانوں کے ڈیزائن اس طرح رکھیں گے۔ جیسے قلعہ تعمیر کر لیا ہو۔ کھانے میں مرچیں، گرم مسالہ اور لونگ کو خاصی اہمیت دیں گے۔ اگر کھانے میں یہ چیزیں نہ ہوں۔ تو یوں سمجھتے ہیں جیسے کھانا ہضم نہیں ہوگا۔

دہلی کی زبان اُردو ہے یا ہندی یا ہندوستانی یا انگریزی یا اردو جمع پنجابی۔ جمع ہندی اور ضرب اُردو ——— اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کہتے ہیں دہلی کی ٹکسالی زبان وہاں کی مہترانیوں کے پاس ہے۔ مگر کچھ اُردو دانوں کا خیال ہے کہ جب سے بہادر شاہ ظفر دہلی سے رنگون کے جیل خانہ میں چلے گئے۔ اس وقت سے دہلی کی زبان "ڈھنگیا" گئی ہے۔ لیکن یہ شاید صحیح نہیں۔ کیونکہ ——— بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ساتھ مہترانیاں نہیں بھاگ گئی تھیں۔ اور وہ آج تک مسلسل بول رہی ہیں۔ اور ہم اُن کا مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور مہترانیاں مُنہ چلاتی جاتی ہیں۔ البتہ کبھی کبھار جب کوئی پنجابی شرارتی اس چلتی ہوئی بجلی میں اپنے پنجابی بادل کی گھن گرج ملا دیتا ہے تو دھوپ چھاؤں کا ایک بِلا جُلا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض دہلی کی

زبان ایک بار پھر "شدھی" کی زد پر ہے۔ ایک طرف سے ویدوں کے عالم اس پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اور دوسری طرف یونین جیک کے علمبردار اس پر یلغار کر رہے ہیں۔ پنجاب اور سندھ کے شرنارتھی بھی اپنے اپنے گز اور بھالے لے کر میدان میں اُتر آئے ہیں اور دہلی کی زبان ایک بار پھر اس مصرعے کا مفہوم بنتی جا رہی ہے کہ ؎

زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

نظم و نسق دہلی کا نظم و نسق اچھا خاصا چل رہا ہے۔ ہر سڑک پر صبح شام جھاڑو دی جاتی ہے۔ ہر گلی میں بجلی کے بلب لگے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں۔ گھر گھر میں پانی پمپ لگے ہوئے ہیں۔ جو پانی کم اور آہیں زیادہ نکالتے ہیں۔ شہر میں چوری چکاری کی ایک بھی واردات نہیں ہوتی۔ اس لئے پولیس کو سوائے لاٹھی چارج کرنے کے اور کوئی کام نہیں رہا۔ پولیس نے کچھ اس حیرت انگیز طریقے پر بندوبست کر رکھا ہے کہ جیب کترے بغیر ان کی اجازت کے جیبیں نہیں کاٹتے۔ آپ سڑکوں اور بازاروں میں چاہے سونا اچھالتے چلے جائیے۔ مگر کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ سونا نہیں ہے بلکہ اس ملمع کے نیچے لوہے کا ٹکڑا یا ٹین کی کترن ہوگی۔ جن کے پاس سونا ہوتا ہے وہ اسے سڑکوں پر نہیں پھینکتے۔ بینکوں میں رکھتے ہیں۔ یہاں کا ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا ہے۔ کوئی آدمی بے کار نہیں رہتا۔ کوئی بلیک مارکیٹ کرتا ہے۔ کوئی سٹہ کھیلتا ہے، کوئی گلے سڑے پھل بیچتا ہے۔ کوئی نوسر

بازی کرتا ہے، کوئی مکھیاں مارتا ہے اور کوئی جوئیں۔ کوئی آہیں نکالتا ہے۔ اور کوئی گالیاں، کوئی سینما کی ٹکٹیں مہنگے داموں بیچتا ہے اور کوئی ناجائز شراب میں بھی پانی ملا کر بیچتا ہے ——— غرض کہ پوری دہلی تندہی سے سوسائیٹی کے ارتقا میں مصروف ہے۔ چند ایسے لوگ ضرور مل جاتے ہیں۔ جو کام کی تلاش میں سچائی کا جھنڈا ہاتھ میں لہراتے برسوں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتے رہتے ہیں اور آخر کار کسی سڑک کے کنارے دم توڑ دیتے ہیں اور ملک کا کوئی ذمہ دار یہ اعلان کر دیتا ہے کہ موت قدرتی طور پر ہوئی ہے۔ بے انصافی تو یہاں نام تک کو نہیں ملتی اور اگر کبھی کبھار ملتی ہے۔ تو انصاف کے لئے عدالتیں موجود ہیں۔ عام طور پر عدالتوں تک پہنچنے سے پہلے ہی انصاف مل جاتا ہے۔ کیونکہ فریادی کے پاس ہائیکورٹ کی فیس کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ محلہ چھوڑ کر ہی بھاگ جاتا ہے اور عدالت کے مشفقانہ اختیارات سے باہر نکل جاتا ہے۔

شہر کا سارا نظم و نسق چنے ہوئے نمائندے کرتے ہیں۔ البتہ ایک الجھن ضرور رہتی ہے کہ دہلی کا اصلی نظم و نسق کس کے ہاتھ میں ہے۔ مرکزی سرکار کہتی ہے۔ دہلی ہماری راجدھانی ہے۔ صوبائی سرکار کہتی ہے کہ بندوبست ہمارا ہے۔ کارپوریشن اپنے نمائندوں کے ذریعے دہلی پر حکومت کرتی ہے۔ اور کبھی کبھی یو۔ پی اور پنجاب کا کوئی وزیر جب دہلی کے اِرد گرد اپنے صوبہ کے دورہ پر گھوم رہا ہوتا ہے تو اُسے بھی شک ہو جاتا ہے کہ دہلی ان کے ماتحت ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی دہلی کے کسی شہری کو ایک کنکوا خریدنا ہوتا ہے تو

اسے برسوں پتہ نہیں چلتا کہ اس کنکوے کا ٹیکس کونسی سرکار کے خزانے میں گیا ہے اور یہ کنکوا کونسی سرکار کے آسمانِ نظم و نسق کی ہوا میں اُڑ رہا ہے۔

حرفِ آخر الحمدللہ! کہ "دہلی کا ایڈ" اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ دہلی کے بارے میں خاکسار مصنّف کے ذہن ناچیز میں جتنی معلومات آئیں وہ سبھی درج کر دی ہیں۔ مصنّف کو شدت سے اس امر کا احساس ہے کہ دہلی کو احاطہ تحریر میں لانا چاند کا مُنہ چڑانے کے مترادف ہے۔ پھر بھی خاکسار مصنّف نے چاند کے مُنہ آنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جن صاحبوں کو یہ کتابچہ پسند آئے وہ مصنّف اور پبلشر دونوں کے لئے دُعائے خیر کریں۔ اور جن صاحبوں کو کتابچہ پڑھ کر کوفت ہوئی ہو، وہ اس کتابچہ کو جامع مسجد دہلی کی بغل میں بیٹھنے والے کباڑیوں کے ہاں اونے پونے بیچ دیں۔ والسلام!

مسٹر فِل فِل فلوس

مسٹر فِل فِل فلوس سے میری ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی۔ اُس وقت وہ اُردو کے ایک اخبار کو اُلٹا پکڑے ہوئے بڑے انہماک سے مطالعہ میں مصروف تھے۔

میرے دوست مسٹر اشونی کمار نے اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"آپ ہیں مسٹر فِل فِل فلوس۔ مشرقی علوم و فنون کے مستند ماہر ——— آج کل ہندوستان و پاکستان کی سیاحت کے سلسلے میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔

"اور آپ ——— ؟"

مسٹر فلوس نے میری طرف اِشارہ کرتے ہوئے متعارف ہونا چاہا ———

مَیں نے اپنے دوست اشونی کمار کے بجائے خود پیشقدمی کی اور پہلے تو مسٹر فِل فِل فلوس کے ہاتھ سے اخبار لے کر اُسے سیدھا کیا اور پھر اُن کے ہاتھ میں واپس دیتے ہوئے کہا ـــــ

"مسٹر فلوس! اس خاکسار کو فِکر تونسوی کہتے ہیں"

مسٹر فلوس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ

"آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ ایسے خاکسار لیڈر سے ملنے کا فخر مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ کہیئے علاّمہ مشرقی کی طبیعت کیسی ہے آج کل؟"

مَیں نے کہا ـــــ "جی اُنہیں ہلکا ہلکا زکام رہتا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ مَیں آج کل خاکسار تحریک کو چھوڑ کر ادب تخلیق کرنے لگا ہوں ــ اِس لئے علاّمہ صاحب سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں۔"

مسٹر فلوس کو شاید میرے خاکسار تحریک سے الگ ہونے پر نہایت افسوس ہُوا اور وہ میز پر کچھ اس غمناک انداز سے اُنگلیاں بجانے لگے۔ جیسے کہنا چاہتے ہوں ـــــ

"آہ! آہ! بہت بُرا ہُوا۔ وَیری بَیڈ نیوز!"

مَیں نے اُن کے غم میں مداخلت کرتے ہوئے کہا ـــــ

"مسٹر فلوس آپ کی پریشانی بجا ہے۔ لیکن آپ اِسے چھوڑیئے اور یہ فرمایئے کہ آپ کا ہندوستان کا دَورہ کیسا رہا؟"

مسٹر فل فل فلوس نے سر کے ایک بال سے پیشانی پر ہندوستان کا نقشہ

بنایا اور پھر اپنی ناک پُھلا کر سنجیدگی برتتے ہوئے کہا ____

"مَیں نے تین دنوں میں پورا ہندوستان دیکھ لیا ہے۔ دُنیا کا کوئی سیّاح اتنی مختصر مدّت میں اتنا مالا مال تجربہ حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ اب میں بہت آسانی سے ہندوستان پر ایک ہزار صفحہ کی مبسوط و مدلل کتاب لکھ سکتا ہوں۔ میرے ملک کی ایک پبلشنگ کمپنی نے ڈیڑھ لاکھ پونڈ میں میری کتاب چھاپنے کی آفر بھیج دی ہے۔"

مَیں نے فرطِ مسرت سے تالی بجائی اور کہا:۔ "مسٹر فلوس! ____ ہندوستان واقعی سونے کی چڑیا ہے۔ یہ چڑیا ایک دن میں پچاس ہزار اور تین دن میں ڈیڑھ لاکھ پونڈ کے انڈے دے سکتی ہے۔ اور مَیں چاہتا ہوں کہ آپ کم از کم ایک مہینہ اور اس ملک میں قیام فرمائیں۔ تاکہ آپ کی پبلشنگ کمپنی پورے ہندوستان کو خریدنے میں کامیاب ہو جائے۔"

مسٹر فل فلوس نے تحسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اور پھر بڑے کاروباری لہجے میں فرمایا ____

"گڈ گڈ! مَیں آپ کی یہ زریں تجویز اپنی پبلشنگ کمپنی کو بھیج دوں گا۔ مسٹر فکرمند! ہماری کمپنی کا بزنس نہایت معقول اور دھندیانہ ہے اور وہ ایسے بڑے بڑے سودوں پر ہمیشہ لبّیک کہتی ہے۔"

اگر مسٹر فلوس ہمارے ملک کا معزز مہمان نہ ہوتا۔ تو شاید اُن کے اِس جواب پر کوئی نازیبا حرکت کر بیٹھتا۔ لیکن مَیں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بات بدلنے کے لئے کہا ____

"مسٹر فل فلوس! کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ ہندوستان آپ کو پسند آیا کہ نہیں؟"

"یقیناً یقیناً" ـــــ مسٹر فلوس نے بے ساختہ جواب دیا ـــــ "مسٹر فکر! مجھے ہندوستان بے حد پسند ہے۔ کیونکہ اس کی آب و ہوا بے حد معتدل اور مرطوب ہے۔ اس لئے یہاں کے باشندوں کا موڈ بھی معتدل اور مرطوب ہی رہتا ہے۔"

"آپ کا اندازہ سو فیصدی صحیح ہے اور مسٹر فلوس! دراصل یہ سب خطِ استوا کی برکت ہے۔ آپ نے راجدھانی دہلی میں خطِ استوا کو گزرتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا؟"

"جی نہیں۔ میں نے دہلی جانے کا پروگرام شروع ہی سے نہیں بنایا تھا۔ کیونکہ جب میں نے یہاں آکر ہندوستان کا نقشہ خریدا تو نقشے پر دہلی کا نام پڑھتے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی خاص بلند پایہ شہر نہیں ہے۔"

"جی نہیں" ـــــ میں نے مسٹر فلوس کی غلطی پکڑلی ـــــ اور انہیں سمجھانا چاہا۔ "آپ یہاں ذرا چوک گئے ہیں مسٹر فلوس! دہلی کا پایہ بلندی پر یعنی ایک پہاڑی پر ہی بنایا گیا ہے۔"

یہ سُن کر مسٹر فلوس کچھ خفیف ہوئے اور پھر اُنہوں نے اس تصحیح کے لئے میرا شکریہ ادا کرنے کے سلسلے میں مجھے ایک سگریٹ پیش کیا۔ اپنی نوٹ بک نکالی اور اس پر نوٹ کر لیا کہ دہلی ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد میرا جی چاہا کہ مسٹر فلوس کو بتا دوں کہ پہاڑی کے علاوہ ایک دریا بھی دہلی کی آغوش میں

بہتا ہے۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ پہاڑ اور دریا میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اکثر دریا پہاڑوں سے ہی نکلتے اور گزرتے ہیں۔ اس لئے مسٹر فلوس پہاڑی کے ساتھ ساتھ خود بخود دریا کا اضافہ کرلیں گے۔ مجھے اُن کی ذہنی پرواز پر اعتماد رکھنا چاہیئے۔

ایک منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ مسٹر فلوس بہت ہی نشیلی کیفیت میں سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔

"مسٹر فلوس!" ــــــ میں نے خاموشی کو توڑنا مناسب سمجھا ــــــ "ہندوستان کے باشندوں کی خوراک اور لباس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

مسٹر فلوس نے میری اس بات کو ہنسی میں اُڑا دیا اور کہا ــــــ

"لباس؟ قہ قہہ قہ قہہ ــــــ آپ بھی کیا بے معنی سوال کرتے ہیں مسٹر فکر! میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی کتاب میں لباس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ خود ہندوستان کے بیشتر سیاست دانوں نے اپنی تقریروں میں بار بار اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان ننگا ہے اور ظاہر ہے کہ علم منطق کی رُو سے جو آدمی ننگا ہو اُس کے لباس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

مسٹر فلوس کی اس مضبوط دلیل پر میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ اور میں نے اُن کی تائید کرتے ہوئے کہا ــــــ

"آپ سچ فرماتے ہیں مسٹر فلوس! ہمارے یہاں کے ایک شاعر مرزا غالب

کا تجربہ بھی بالکل آپ سے ملتا جلتا ہے۔ انھوں نے بھی ایک شعر میں فرمایا ہے کہ ع

تن کی عریانی سے بہتر ہی نہیں کوئی لباس

اچھا خیر آپ اس عریاں نگاری کو چھوڑیئے اور کچھ یہاں کی خوراک کے متعلق ارشاد فرمایئے۔ کیا آپ نے یہاں آکر ہندوستان کا نمک کھایا ہے؟"

"کھایا تو نہیں ہے لیکن یہاں آکر یہ چھان بین ضرور کر لی ہے کہ یہاں کے ایک لیڈر مسٹر گاندھی نے ایک مرتبہ ہندوستان کے باشندوں کی خوراک کا مسئلہ حل کرنے کے لئے برطانوی حاکموں سے مطالبہ کیا تھا کہ اگر ہندوستان کے عوام کو نمک کھانے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو یہاں کا فوڈ پرابلم سرے سے ختم ہو جائے گا۔ یہ مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ اور آج کل ہندوستانی باشندے بڑے مزے سے نمک پکا پکا کر کھاتے اور پیٹ بھرتے ہیں۔"

"آپ کو پھر غلط فہمی ہوئی۔" میں نے مسٹر فلوس کی خدمت میں پھر مجبوراً گستاخی کی ——

"دراصل نمک یہاں نہ صرف بطور غذا استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے الیکٹرک بھی پیدا کی جاتی ہے۔ شاید آپ نے علم ریاضی میں یہ پڑھا بھی ہوگا کہ نمک میں تیزاب ہوتا ہے۔ اور تیزاب میں آگ ہوتی ہے۔ اور آگ میں الیکٹرک ہوتی ہے۔ جس سے پنکھے چلتے ہیں۔ کارخانے چلتے ہیں۔ اور جب کبھی چلتے چلتے تھم جاتے ہیں تو اس کی بجائے لُو اور جھکڑ چلتے ہیں۔ غرض اسی طرح ہندوستان کا قافلہ چلتا ہی رہتا ہے۔"

مسٹر فلپس نے پہلے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ اور پھر حسرت سے دیکھا اور پھر نوٹ بک میں نوٹ کر لیا اور فرمایا ——

مسٹر فکر! آپ کی ان معلومات کا میں بے حد ممنون ہوں اور میں آپ کی اس نوازش کا ذکر اپنی کتاب "وہاٹ اباؤٹ انڈیا" میں ضرور کروں گا۔ آپ کو یہ سُن کر بے حد دلچسپی ہوگی۔ کہ پانچ سال پہلے میں نے ہندوستان اور چین کے شاعرانہ تعلقات پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ اور اُس میں —— میں نے ثابت کیا تھا۔ کہ جہاں ایک طرف ہندوستان کے دریائے "کرشنا" کے ساحل پر شاعروں کی سینکڑوں بستیاں آباد ہیں۔ وہاں چین کے دریائے "ہوانگ" پر بھی گیت نگاروں کی بستیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مشابہت کی جڑیں زمین کے سینے میں بہت گہری چلی جا چکی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں دریائے کرشنا اور دریائے ہوانگ ایک دوسرے کے متوازی بہتے تھے۔ اور پھر تحقیق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چند دریاؤں کے پانی میں شعریت کی مقدار بدرجۂ اُتم موجود ہوتی ہے اور ۔۔۔۔"

میں نے بے قرار ہو کر بات کاٹ دی اور اُچھل کر کہا ——

"ونڈر فل! ونڈر فل!! مسٹر فلپس! یہ دریا نہیں ہیں۔ شاعری سکھانے کے کالج ہیں۔ اور آپ کی قوّتِ تحقیق و تخیّل پر مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ ذرا توجّہ سے سُنیئے گا۔ ؎

اُلجھی دریا میں کلائی زلفِ اُلجھی بام میں
مورچہ محمل میں دیکھا آدمی بادام میں

شعر سُن کر مسٹر فلوس نے داد دینی چاہی۔ اور اپنی آنکھیں اس طرح بکھیر لیں کہ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے یہ آنکھیں نہیں ہیں، شرح دیوانِ غالب ہیں بولے۔

"میں نے یہاں ہندوستان میں کئی بھینسیں دیکھی ہیں۔ اُن کے بدن میں خاص چمک دیکھی ہے۔ ایسی چمک صرف اُن چیزوں میں ہوتی ہے جن میں شعریت اور لطافت بے پناہ ہوتی ہے۔ آدمی اُن بھینسوں کو دیکھ کر مستانہ وار جھوم جاتا ہے۔"

"جی ہاں!" میں نے جھومتے ہوئے کہا ——— "ہمارے یہاں تو بھینس کو ایک غزل سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ لیکن بات یہ ہے مسٹر فلوس! کہ جب سے ہندوستان میں ماڈرن قسم کی آزاد شاعری نے اپنا سکّہ جمانا شروع کیا ہے۔ بچاری بھینس کا ادب اور شعر میں کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔ آج کل کی ماڈرن شاعری میں تو کوّا پردھان ہے مسٹر فلوس! آپ نے کالی داس اور تلسی داس کی تصانیف تو پڑھی ہی ہوں گی؟"

مسٹر فلوس نے اپنے چرمی بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُس میں سے کاغذوں کا ایک بڑا سا پلندہ نکال کر بولے ———

"کالی داس؟ ——— کالی داس پر تو مَیں نے ایک مکمل تھیسس لکھا تھا۔ اس تھیسس سے یورپین لٹریچر میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ کیونکہ میں نے اُس میں ثابت کیا تھا کہ کالی داس کے ناول کسی اعتبار سے بھی "کانن ڈائل" کے ناولوں سے کم حیثیت نہیں رکھتے۔"

"بجا ارشاد فرمایا" ——— مَیں نے بڑے غرور سے کہا ——— "مسٹر فلوس!

یورپ کو آخر کار ایشیا اور بالخصوص ہندوستان کی لٹریری رہنمائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ کالی داس کے جاسوسی ناولوں کی دھوم آخر کیوں ہے؟ یہ ایک نہایت پُراسرار مسئلہ ہے۔ جس پر آج تک روشنی نہیں ڈالی گئی۔ کاش یورپین نقادوں کو یہ معلوم ہوتا کہ کالی داس کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ یہ شہنشاہ اکبر کے محکمۂ سُراغ رسانی میں چیف آف دی اسٹاف تھے۔"

مسٹر فلوس یہ سُن کر اپنے صوفے سے اُچھل پڑے۔ اور پھر بولے ——

"اچھا! کیا یہ واقعی سچ ہے مسٹر فکر؟"

"بالکل سچ ہے۔ بھلا جھوٹ بولنے میں مجھے ذاتی طور پر کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟"

"اجی نہیں مسٹر فکر! یہ ذاتی فائدے کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہے ہی خالص ریسرچ کا مسئلہ۔ ریسرچ میں جو آدمی ذاتی فائدہ ڈھونڈنا چاہتا ہے اُسے کچھ مل ہی نہیں سکتا مجھے آپ کی زبان پر بھی اعتبار آگیا۔"

"شکریہ!"

اس اعتماد کی فضا میں نوٹ بک پھر نکالی گئی۔ کالی داس کے بارے میں نوٹ کیا گیا اور پھر مسٹر فلوس نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا ——

"آہ! ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے مسٹر فکر! کہ اسے غیر ملکی مؤرخوں نے آج تک غلط رُوپ میں پیش کیا ہے۔ یہاں آکر جو کچھ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اُس کے بعد میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ایسے تمام غیر ملکی مؤرخوں کی کی کتابیں قانوناً ممنوع قرار دے دی جائیں۔ آہ! کبھی کبھی رات کی خاموش

تنہائیوں میں میں سوچتا ہوں کہ ہندوستان کو حقیقی مؤرخ کب ملے گا؟"

میں نے فوراً جواب دیا ـــــ

"مسٹر فلوس! اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ ہندوستان آپ کی کتاب کا بے چینی اور اشتیاق سے انتظار کر رہا ہے۔ تاریخ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ناانصافی نہیں کر سکتی۔ آخر ایک نہ ایک دن کوئی مردِ مجاہد اپنی نیلگوں کرنوں کے ساتھ مطلع ہندوستان پر جلوہ گر ہوتا ہے اور سارے گلے شکوے دُور کر دیتا ہے۔ آپ کو مسٹر فلوس! یقین تو نہ آئے گا۔ لیکن تکلف برطرف! آپ ہندوستان کے کلکی اوتار ہیں۔"

"جی نہیں، مجھے آپ پر پختہ یقین ہے۔"

"شکریہ!"

میں نے ہلکے سے تالی بجائی۔

"مثال کے طور پر دیکھئے" ـــــ مسٹر فلوس کی آواز اب جوشیلی ہوگئی تھی ـــــ "ہندوستانی معاشرت میں ایک چیز نے میرے تاریخی اعصاب پر گہرا اثر چھوڑا ہے اور وہ چیز ہے ہندوستان کی تنکوں کی جھونپڑیاں۔ جس پر کسی مؤرخ کی آج تک نظر نہیں پڑی۔ مؤرخ کی نگاہ ہمیشہ گہری اور تیکھی ہونی چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ جھونپڑیاں جدید سائنسی دریافتوں کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ ہیں۔ نہایت ہلکی پھلکی سادہ اور ہوادار جھونپڑیاں۔ یورپ والوں کو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ آج انھوں نے اپنے آپ کو مکانوں کے پرابلم میں کس طرح اُلجھا رکھا ہے۔ اور سستے اور چلتے پھرتے اور ریڈی میڈ مکانوں کی

پیچیدگیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ انھیں سبق کے طور پر ہندوستان کی طرف دیکھنا چاہیے۔ مسٹر فکر! صرف آٹھ دس روپے کے تنکے اکٹھے کر کے مکان کھڑا کر لینا ۔۔۔؟......
کتنا سادہ اور آسان عمل ہے۔ نہ بیمہ کرانے کی ضرورت نہ انجینئرنگ کا جھنجھٹ۔ کہیں جانا ہو تو تنکے سمیٹ کر خچروں پر لادلو۔ میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کی جھونپڑیاں سائنسی دریافتوں کا معراج ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا کہ

"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"

مسٹر فلوس نے کہا ۔۔۔

"اِس شعر کا کیا مطلب ہے؟"

میں نے کہا ۔۔۔ "جی یہ شعر دوسری بڑی جنگ میں لکھا گیا تھا۔ شاعر کے ذہن میں اِس کا مفہوم یہ تھا کہ جنگ کے دوران میں تمام عالم یعنی تمام ہندوستان پر حلقۂ دامِ خیال یعنی ڈیفنس آف انڈیا رولز لاگو ہے۔"

"خوب! اور مسٹر فکر! اس شعر کا کمال یہ ہے کہ اس کی ایک دوامی حیثیت ہے۔ یعنی جب بھی آئندہ کبھی جنگ ہوگی یہ شعر اُس وقت بھی کارآمد ہوگا۔"

یہ سُن کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ مسٹر فلوس مشرق کے مستقبل پر اتنی واضح پیشگوئی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ بات میرے لئے اِنتہائی تحیّر انگیز تھی۔ بہرکیف اِس پیشگوئی کے بعد کوئی سوال کرنا اپنے آپ کو پریشان کرنے کے مترادف تھا۔ اِس لئے میں نے رخصت چاہی اور رخصت ہونے سے پہلے مسٹر فلوس سے پوچھا ۔۔۔

"مسٹر فلوس! آپ نے تاج محل تو دیکھا ہی ہوگا؟"

"اوہ! تاج محل؟" مسٹر فلوس نے اُچھل کر کہا — "میں اس موضوع پر بھی ایک الگ کتاب لکھنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ ہوائی جہاز سے اُترتے اُترتے میں نے تاج محل کا نظارہ کر لیا تھا۔ اگرچہ اس دن میری دوربین قدرے ٹوٹی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے کافی مواد اخذ کر لیا۔ جو ایک مدلّل کتاب کے لئے ....."

"مسٹر فلوس! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ..." میں نے سنجیدگی سے پوچھا — "کہ آپ یہ کتاب لکھنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں؟"

"یہ تو مشکل ہے!"

"پھر بھی کوئی نہ کوئی صورت نکالیے جس سے یہ کتاب نہ لکھی جا سکے۔"

اس پر مسٹر فلوس ہنس پڑے — "آپ نہایت دلچسپ مذاق کرتے ہیں مسٹر فکر! مجھے ایسے لطیف مذاق بے حد پسند ہیں۔"

"اور آپ نے اس گفتگو کے دوران میں جتنے مذاق کئے وہ مجھے بھی بے حد پسند آئے۔ یہ دُنیا ایک مذاق ہی تو ہے مسٹر فلوس!"

اِس پر مسٹر فلوس نے ایک قہقہہ لگایا۔ میں نے بھی مہمان نوازی کے طور پر جوابی قہقہہ لگایا اور ہم دونو ہنستے ہنستے جُدا ہو گئے۔

نوٹ:۔ آج نو ماہ بعد مسٹر فل فل فلوس کی کتاب "وہاٹ اباؤٹ انڈیا" کا اشتہار ایک انگریزی رسالے میں دیکھ کر مجھے یہ مضمون لکھنے کا خیال آ گیا۔

کرائے کا مکان

بات یوں ہوئی کہ جب اس شہر میں میری ملازمت کا انتظام پکّا ہو گیا۔ تو تہذیب یافتہ انسانوں کی طرح میں نے مناسب سمجھا کہ اب ایک کمرہ کرائے پر لے ہی لیا جائے۔

کرایہ پر کمرہ لینے کی ایک معقول وجہ تھی کہ میرے والدین کا جدّی مکان صرف ایک ہی تھا۔ چونکہ میرے والدین تاریخ اور سیاست سے بالکل کورے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنا مکان پاکستان ہی میں بنایا تھا۔ چنانچہ ایک بزرگ کے قول کے مطابق اگر جدّی مکان پاکستان میں ہو تو ہندوستان میں کرایے پر ہی کمرہ لینا پڑتا ہے۔

قصّہ کوتاہ یہ کہ ——— ایک دن لالہ پنڈیداس ریٹائرڈ ریلوے گڈس کلرک سے میری مُلاقات ہُوئی اور انھوں نے اپنی بلڈنگ میں دوسرے کرایہ داروں کے ساتھ

ساتھ مجھے بھی سیکنڈ فلور پر ایک کمرہ بیس روپیہ ماہوار کرایہ پر دے دیا۔ اور مَیں نے لالہ پنڈی داس سے کہا۔ "آپ کتنے فرشتہ سیرت اِنسان ہیں؟"

اُنھوں نے مُسکرا کر کہا۔ "آپ بھی بڑے شریف انسان معلوم ہوتے ہیں"

مَیں نے کہا ——— "جیسے کو تیسا!"

لالہ پنڈی داس نے پہلے دن کا مہمان سمجھ کر میری کافی آؤ بھگت کی۔ یعنی پانی کا ایک گلاس پلایا، ایک بیڑی پیش کی۔ اور مَیں نے اِس خاطر تواضع کا احسان چُکانے کے لئے اُن کی خدمت میں بیس روپے نقد پیشگی کرایہ پیش کر دیا۔ اور ہم ایک دوسرے کے یوں نزدیک آ گئے۔ جیسے بھیڑا اور بھیڑیا ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں۔

لالہ پنڈی داس نے تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کرایہ پیشگی ہی لیا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اُن کا اصول ہے۔ مَیں نے کہا۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا اصول ہے۔ اصول پر عمل کرنا شیطان کا نہیں اِنسان کا کام ہے۔ اس پر لالہ پنڈی داس کی باچھیں کھِل گئیں۔ اور دانت نکل آئے۔ اُن کے دانت میلے تھے۔ اگر یہ شخص میرے دیئے ہوئے بیس روپوں میں سے ایک روپیہ کا ٹوتھ پیسٹ لے آئے۔ تو اس کے دانت خاصے اچھے ہو سکتے ہیں۔ لیکن پھر مَیں نے سوچا۔ کہ مجھے دوسرے آدمی کے دانتوں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے ہر ایک کا اپنا اپنا اصول ہے۔

چنانچہ مَیں کمرہ میں رہنے لگا۔ کمرہ اچھا بھلا تھا۔ یعنی ہوا اور روشنی کے لئے چوبیس مُربع اِنچ کی ایک معقول سی کھڑکی بھی تھی۔ سونے جاگنے،

کھانا پکانے، کپڑے دھونے، پڑھنے لکھنے اور ڈنٹر پیلنے ——— غرض ہر ضرورت کے لئے اِس ایک کمرہ میں سبھی امکانات موجود تھے۔ بجلی کا ایک بلب بھی لگا ہُوا تھا۔ جسے لالہ پنڈی داس نے یہ کہہ کر اُتار لیا کہ یہ بلب سابقہ کرایہ دار کا ہے۔ جو بغیر پیشگی کرایہ دیئے مکان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اور اس لئے وہ بلب بحق سابقہ کرایہ ——— لالہ پنڈی داس کے پاس ضبط رہے گا۔ چنانچہ اپنے لئے میں ایک نیا بلب لے آیا۔ میرے اس نئے بلب کو دیکھنے کے لئے لالہ پنڈی داس جی میرے کمرہ میں بہ نفسِ نفیس آگئے۔

"کتنے پاور کا لائے ہیں؟" وہ بلب کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے تاکہ میں جھوٹ بولنے کے قابل نہ رہوں۔

"ساٹھ پاور کا۔" میں نے سچ سچ بتا دیا۔

"بات یہ ہے جی! کہ میں بجلی وغیرہ جلانے کے معاملے میں ذرا صاف گو واقع ہُوا ہوں۔ یہ ساٹھ پاور کا بلب ہے۔ بجلی زیادہ کھینچیگا۔ اِس لئے آپ کو ایک روپیہ کی بجائے دو روپے ماہوار دینا پڑیں گے۔"

"میں تو ایک ہی روپیہ دینا پسند کروں گا۔" میں نے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔

"تو پھر آپ کو تیس پاور کا بلب ہی لانا پڑے گا۔"

"لیکن لالہ جی! مطالعہ کرنا میرا پیشہ ہے اور مطالعہ کے لئے کافی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ آدمی خلاف توقع اندھا ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر دو روپے دیا کیجئے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں،

کہ ۹ بجے کے بعد بجلی کا مین سوئچ نیچے سے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ میرا قاعدہ ہے۔"

لیکن لالہ پنڈی داس جی! میرا قاعدہ یہ ہے۔ کہ مَیں ایک بجے رات تک پڑھتا ہوں۔ جب سارا عالم سوتا ہے تو مَیں چپکے چپکے روتا ہوں۔ اور سارے جہان کا درد اپنے جگر سے نکال کر کاغذ پر لے آتا ہوں۔ اِس لئے ....."

اِس لئے زیادہ بحث بے کار تھی۔ میرا قاعدہ بے قاعدہ ثابت ہُوا اور لالہ پنڈی داس کا قاعدہ باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ اَور مَیں بازار سے مٹی کے تیل کا ایک بڑا سا لیمپ لے آیا۔ لیمپ کو دیکھتے ہی لالہ پنڈی داس نے میری بجلی کی تار کاٹ دی۔ اَور مَیں خوش و خرّم وہاں رہنے لگا۔

چار پانچ دن اس ہنسی خوشی میں گذر گئے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ لالہ پنڈی داس اور میرا تعلق صرف کرایہ دینے اور لینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ ان تعلّقات کی جڑیں پتھر اور دھات کے اُس زمانہ تک گہری چلی گئی ہیں۔ جب کہ اِنسان نے پہلے پہل جھونپڑی بنا کر رہنا سیکھا تھا۔

میرے کمرہ میں جو کھڑکی تھی۔ وہ میرے لئے روشنی اور ہوا کا واحد منبع تھی اس لئے مَیں اکثر اُسے کھُلا رکھتا تھا۔ لالہ پنڈی داس نے جب متواتر پانچ دن اُسے کھلی حالت میں دیکھا۔ تو اُنھوں نے ایک دن مجھے دفتر جانے کے وقت اِشارے سے بُلا لیا۔ اور نصیحت کی۔ کہ اس کھڑکی کے عین سامنے چونکہ چند عزّت دار لوگ رہتے ہیں۔ اِس لئے آپ جیسے عزّت دار آدمی کے لئے یہ مناسب نہیں

کہ ہر وقت کھڑکی کھلی رکھیں۔

مَیں نے کہا۔" لالہ پنڈی داس جی! دو عزت دار عناصر میں کبھی تصادم نہیں ہو سکتا۔ ریاضی کے اصول کے مطابق دو متوازی لکیریں صدیوں ایک دوسرے سے نہیں ٹکرا سکتیں۔" مگر لالہ پنڈی داس شاید ریاضی میں بے حد کمزور تھے۔ اس لئے میری بات اُن کے پلّے نہ پڑی۔ اس پر مَیں نے سوچا۔ انہیں بتا دوں کہ سامنے والے گھر میں عزّت دار عورت کوئی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک ساٹھ سالہ بڑھیا رہتی ہے۔ جو دن بھر دھوپ میں بیٹھی سر میں سے جوئیں نکالتی رہتی ہے ـــــــ لیکن مَیں نے پھر سوچا۔ کہ اگر لالہ پنڈی داس کو یہ بات بتا دی۔ تو گویا دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ مَیں تاک جھانک واقعی کرتا رہتا ہوں ـــــــ اس لئے خاموش ہو گیا۔ اور کھڑکی بند کر کے اس ساٹھ سالہ نازنین کے حُسن کا دروازہ اپنے اُوپر بند کر لیا۔ کسی کی عزّت پر حملہ کرنا تو ویسے بھی میرا شیوہ نہیں رہا تھا اور پھر کھڑکی بند ہونے سے لالہ پنڈی داس کی نظروں میں بھی میری عزّت بڑھ گئی! کہتے ہیں۔ دوسروں کی عزّت کرنا سیکھو۔ تو خوامخواہ اپنی بھی عزّت بڑھتی ہے۔

کھڑکی بند ہوئی تو روشنی اور ہوا بھی بند ہو گئی۔ اور مجھے دو تین دن تک بے حد غُصّہ آتا رہا۔ جو آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے درجۂ عبرت تک پہنچ گیا۔ کئی بار جی میں آیا کہ لالہ پنڈی داس کو صاف صاف کہہ دوں کہ یہ کھڑکی کھلی ہی رہے گی۔ آپ میرا جو کچھ بگاڑنا چاہتے ہیں۔ بگاڑ لیجئے لیکن بہت سے دوسرے ارادوں کی طرح یہ ارادہ بھی عزّتِ نفس کی دیوی

پر بھینٹ چڑھ گیا اور میں بغیر ہوا اور روشنی کے رہنے کی مشق کرتا رہا۔ سکول میں پڑھی ہوئی کتاب کا یہ شعر اس موقع پر بے حد کام آیا کہ ؎

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

پوری بلڈنگ میں صرف ایک پاخانہ تھا۔ معلوم ہُوا کہ وہ پاخانہ صرف اہل و عیال والوں کے لئے ہے۔ اور بغیر اہل و عیال والے حضرات ہر صبح باہر کھیتوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ لالہ پنڈی داس نے مجھے بار بار سمجھایا کہ پاخانہ کا یہ مسئلہ بلڈنگ کی تعمیر کے وقت بھی سامنے آیا تھا۔ اور اُن کے والد بزرگوار اور ان کے درمیان ہفتوں اس مسئلہ پر بحثیں اور میٹنگیں ہوتی رہی تھیں کہ کیا بیس روپے ماہوار والے کمرے بیوی والوں کو دیئے جائیں یا بغیر بیوی والوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب یہ قطعی فیصلہ ہو گیا کہ ایسے کمرے صرف بغیر بیوی والوں کے لئے ہی ریزرو کئے جائیں تو اُن کے لئے پاخانہ بنانے کا سوال ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ اب وہ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ کئے ہوئے اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ناخلف نہیں ہیں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ منطق میری سمجھ میں کافی دیر تک نہ آئی۔ اس لئے ایک دن لالہ جی نے خشمگیں ہو کر فرمایا:-

"تم نے تعلیم نہیں پائی جھک ماری ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اس کا اعتراف ہے۔ مگر اسے میری انسانی کمزوری پر محمول فرما کر نظر انداز کر دیجئے۔"

اور پھر جب ہر صبح میں کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ تو یوں لگتا۔ جیسے میں حاجت

رفع کرنے کیلئے نہیں جارہا۔ بلکہ واقعی جھک مارنے جارہا ہوں۔ جیب جاتے ہوئے صابن۔ تولیہ اور ٹوتھ برش بھی ہمراہ لے جانا پڑتا۔ کیونکہ مجھے اپنے کمرہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر بنے ہوئے ایک کنوئیں پر نہانا بھی پڑتا تھا۔

کنوئیں پر نہانے کا آغاز یوں ہوا۔ کہ ایک دن حسب دستور لالہ پنڈی داس کی بلڈنگ کے نچلے صحن میں سے پانی کی بالٹی بھر کر اپنے کمرہ میں لے آیا۔ اور وہاں نہانے لگا۔ لالہ پنڈی داس نے پانی بھرنے کی فیس ایک پیسہ فی بالٹی رکھی ہوئی تھی۔ پہلے تو یہ فیس مجھے بُری طرح کھٹکی۔ اور یوں لگا جیسے مجھے ذلیل کیا جارہا ہے۔ لیکن بعد میں یہ سن کر دل کو تسلی ہوئی کہ نل سے زیادہ مقدار میں پانی بھرتے رہنے کے باعث نل کی کئی بار مرمت کرنا پڑتی ہے۔ اور چونکہ لالہ جی یہ پانی خود استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ کرایہ دار استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے مرمت کا بوجھ براہِ راست ہر بالٹی پر فی پیسہ کے حساب ڈال دیا جائے۔

اور ہم ہنسی خوشی ایک ایک بالٹی کا ایک ایک پیسہ برداشت کئے جارہے تھے۔ مگر اُس دن جب میں اپنے کمرہ میں نہانے لگا۔ تو اچانک نیچے سے آواز آئی۔

"بدتمیز کہیں کے! شرم بھی نہیں آتی ان شہدوں کو۔"

ظاہر ہے کہ میں کوئی بدتمیزی نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے میں نہانے میں مگن رہا۔ اور "پیا ملن کو جانا" کا گیت گنگناتا رہا۔

"کنجر خانہ کھول رکھا ہے اوپر! میں کہتا ہوں۔ تم لوگ انسان ہو یا گدھے؟ اتنی عقل بھی نہیں کہ یہ گلی ہے تمہارے باوا کی جاگیر نہیں ہے۔"

یوں محسوس ہوا جیسے واقعی مجھے ہی مخاطب کیا جارہا ہے۔ کھڑکی کھول کر

دیکھا۔ تو ایک سفید پوش سے بابو جی کھڑے اُوپر میرے کمرے کی طرف منہ اُٹھائے مجھے للکار رہے ہیں۔ اُن کے سفید کپڑے گندے پانی کے چھینٹوں سے بُری طرح بھیگ گئے ہیں ——— قصور میرا تھا یا اُس سفید پوش کا؟ اس کا فوری فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن لالہ پنڈی داس جی اس موقع پر میرے آڑے آئے اور آکر ثابت کر دیا کہ قصور میرا ہی تھا۔

مَیں نے کہا۔ "اگر آپ کی ٹین کی نالی ٹوٹی ہوئی نہ ہوتی۔ تو یہ قصور مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوتا۔

لالہ جی نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "ٹین کی نالی کا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ قصور پانی کا ہے۔ جس سے آپ نہا رہے تھے۔ اگر آپ نہ نہاتے تو اس سفید پوش کے کپڑے کبھی نہ بھیگتے۔"

مَیں نے وضاحت کی کہ کمرہ میں نہانا ہی پڑتا ہے۔

لالہ جی نے وضاحت کی کہ یہ کمرہ رہنے کے لئے ہے۔ نہانے کیلئے نہیں کیونکہ یہ کمرہ ہے غسلخانہ نہیں ہے۔

"تو غسل خانہ کہاں ہے؟" مَیں نے پُوچھا۔

"غسل خانہ بیس روپے ماہوار والے کمرے کے ساتھ نہیں مل سکتا۔"

"تو پھر نہایا کیسے جائے؟"

اور پھر اس "کہاں؟" کے جواب میں لالہ جی نے مجھے اس کنوئیں کا راستہ دکھا دیا۔ جہاں نہ فی بالٹی فی پیسہ کا بوجھ تھا۔ نہ ٹین کی نالی تھی۔ اور نہ ہی سفید پوشوں کا گذر ہوتا تھا ——— اگرچہ یہ بات میری سمجھ سے پھر بھی بالاتر ہی رہی کہ

جب ٹین کی نالی ٹوٹ جاتی ہے۔ تو اُس کی مرمّت کی ذمہ داری کس کے سر ڈالی جائے؟ اور اگر نالی سے لالہ پنڈی داس جی کا تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ تو اس کمرے سے اُن کا تعلق کیسے قائم ہے؟

مگر یہ میرا وہم تھا۔ کیونکہ لالہ جی کا تعلق ابھی صرف نالی ہی سے ٹوٹا تھا۔ مگر کمرے کی چھت اور دیواروں سے ابھی تک قائم تھا۔ اور کمرے کی ایک ایک اینٹ پر اُن کی مُہر ثبت تھی۔ کیونکہ جب دو تین ماہ گذر گئے تو مجھے خیال آیا کہ بازار کے تندوروں اور ہوٹلوں کی روٹی میری صحّت کو گھُن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ اس لئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کم از کم سبزی تو گھر پر ہی پکانی چاہیئے۔ چنانچہ مَیں فوراً بازار سے چُولھا اور کوئلے لے آیا۔ اور آتے ہی اُنھیں دہکانے لگا۔

یہ بات حیرت ناک ہوئی کہ اِس نئی تبدیلی کی بُو سونگھتے اور لالہ پنڈی داس چُپ چاپ کان لپیٹ لیتے۔ چنانچہ دُھواں دیکھ کر اُنھیں آگ کا خیال آیا۔ اور آگ سے مکان جلنے کا خطرہ محسوس کر کے وہ میرے کمرہ میں تشریف لے آئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بولے۔

"انگیٹھی دہک رہی ہے" مَیں نے سلیس ترجمہ کیا۔

"وہ تو مَیں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ کمرہ ہے یا بھٹیار خانہ۔ جانتے ہو یہ کمرہ تم نے کرایہ پر لے رکھا ہے۔ خریدا نہیں ہے؟"

میں نے مکان خریدنے کا کبھی دعویٰ تو ایک طرف خیال تک نہیں کیا تھا۔ اس لئے یہ الزام سن کر مجھے بے حد غصّہ آیا۔ جسے میں نے دبا کر کہا۔
"لالہ پنڈی داس جی! بازار کا کھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ آپ میری صحّت کو ذرا غور کی نگاہوں سے دیکھئے۔"
"میں نے غور سے ہی دیکھ لیا ہے۔ کہ اس چولھے اور دھوئیں سے اس کمرہ کی چھت اور دیواریں کالی سیاہ ہو جائیں گی۔ اور کمرہ کوٹھڑی کا نہیں رہے گا۔"
"تو پھر یہ بتا دیجئے کہ میں یہ کھانا کہاں پکاؤں؟"
"باہر گلی میں انگیٹھی رکھ لیجئے اور وہیں پکا لیجئے"
تجویز نامعقول نہیں تھی۔ کوئلوں کے دھوئیں سے چھت اور دیواریں سیاہ ہو جاتی ہیں۔ سیاہ رنگ لطیف احساسات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ چونکہ میں بھی ایک آرٹسٹ تھا۔ اس لئے مجھے اپنی یہ حرکت بے حد بری لگی۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ اور لالہ پنڈی داس سے معافی مانگی۔ اور انگیٹھی اٹھا کر گلی میں لے آیا۔
دو دن تک گلی میں بیٹھ کر بھٹیار خانہ کھولنے کے بعد تجربہ یہ ہوا۔ کہ لوگ باگ آتے جاتے مسکراتے ہیں۔ چند ایک عورتوں کی انگلیاں بھی اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ اس لئے انگیٹھی واپس کمرہ میں لا کر رکھ دی۔ سرد اور منجمد انگیٹھی ایک آہ سرد کی طرح کونے میں پڑی رہی۔ مگر میں نے لالہ پنڈی داس سے اتنا تک نہ کہا کہ آپ کے کمرہ کے حسن کو قائم رکھنے کے لئے میں اپنی صحّت

کی قربانی دے رہا ہوں۔ اِس لئے ظالم! کبھی کبھی داد ہی دے دیا کرو۔!

آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے یہ کمرہ کرایئے پر نہیں لے رکھا بلکہ کمرہ نے مجھے کرایہ پر لے رکھا ہے۔ کیونکہ مسلسل ایسے واقعات نے جنم لینا شروع کیا۔ جو میرے اور کمرے کے درمیان خلیج حائل کرتے گئے۔ اگر میں کبھی چارپائی کھسکاتا تو کمرہ کانپ اُٹھتا۔ اور لالہ پنڈی داس کو اپنے کمرے کے فرش کی اینٹیں اُکھڑنے کا غم ستانے لگتا۔ دروازہ بند کرتے وقت اگر میں موڈ میں آجاتا۔ اور کواڑ کو قدرے دھماکے سے بند کرتا۔ تو لالہ پنڈی داس کا سینہ بج اُٹھتا اور وہ نیچے ہی سے آواز دیتے۔ "یہ کون کم بخت دروازے کو توڑ رہا ہے"۔۔۔ کیلنڈر لٹکانے کے لئے دیوار میں کیل ٹھونکنا چاہی۔ تو وہ کیل لالہ جی کے عین سر میں جا کر گڑ گئی۔

گرمیاں آئیں۔ تو رات کو سونے کے لئے نیچے گلی میں جانا پڑا۔ کیونکہ کمرہ کی چھت پر بال بچوں والے عزت دار لوگ سویا کرتے تھے۔ اور لالہ پنڈی داس کا یہ اصول اُن کے باپ کی وصیت کے مطابق تھا۔ جس میں تبدیلی کرنا ماضی سے رشتہ توڑنا تھا۔ ماضی کی اس کلاسیکل روایت کو توڑنے کا خیال ہی مجھے کپکپا دیتا۔

اور آخر ایک دن تاریخ اپنے نازک موڑ پر آپہنچی۔ اور میں نے لالہ پنڈی داس کے سامنے اپنا دِل کھول کر رکھ دیا۔

اُس دن حسب معمول میں گیارہ بجے رات کو گھر پہنچا۔ اور

حسب معمول دروازہ بند تھا۔ صدر دروازہ کھلنے کے بعد ہی میرے کمرہ کی سیڑھیاں نمودار ہو سکتی تھیں۔ دیوار کوئی تھی نہیں جو پھاندی جا سکتی۔ اس لئے حسب معمول میں نے لالہ پنڈی داس جی کو آواز دی کہ دروازہ کھول دیا جائے۔

لالہ جی بڑبڑاتے ہوئے نیچے اُترے۔ اور میری طرف گھور کر دیکھا اور بولے۔ "اتنی رات گئے تک آپ کہاں رہے؟"

"گھومتا رہا، یار دوستوں کے ساتھ گپ بازی کرتا رہا۔"

"تو گویا آپ آوارہ گردی بھی کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ پولیس نے اس جُرم میں مجھے کبھی گرفتار نہیں کیا۔"

"لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ شریف آدمیوں کا طریقہ نہیں ہے ہماری بلڈنگ میں یہ نہیں چلے گا۔ براہ مہربانی آپ زیادہ سے زیادہ نو بجے تک واپس آجایا کیجئے۔ ورنہ یہ دروازہ نہیں کھلیگا۔ سمجھے آپ؟"

"جی ہاں! ——— آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں اپنے سونے کا بندوبست ایک اور جگہ کر لوں گا۔"

اس واضح گفتگو کے بعد رات کو میرا اپنے گھر جانا بے کار تھا۔ میں نے ایک سرائے والے سے بات کی۔ اور وہ مجھے چھ آنے فی رات کے حساب سے سونے کی جگہ اور چارپائی دینے پر آمادہ ہو گیا۔ بستر میں اپنے کمرہ سے اٹھا کر سرائے میں لے آیا۔

اور دو ہفتہ بعد ——— آج یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں مہینہ میں

ایک بار لالہ پنڈی داس کے ہاں جاتا ہوں۔ بیس روپیہ کرایہ اُن کی ہتھیلی پر رکھ دیتا ہوں۔ اور نیچے کھڑے کھڑے ہی اپنے کمرہ پر ایک حسرت آمیز نگاہ ڈال لیتا ہوں۔ اور واپس سرائے میں آجاتا ہوں۔ لیکن آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں نے یہ کمرہ کیوں کرائے پر لے رکھا ہے۔ جب کہ عملی طور پر میرا اور اُس کا تعلق ٹوٹ چکا ہے۔

اور لطف یہ ہے کہ اس کے بعد لالہ پنڈی داس کو مجھ سے ایک بار بھی شکائت پیدا نہیں ہوئی۔ اور وہ جب بھی ملتے ہیں۔ یہی کہتے ہیں کہ آپ بہت شریف کرایہ دار ہیں۔